سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ (۳۰۹)
شعبۂ مطبوعاتِ کشمیر نمبر (۳)

برف میں آگ

منتخب افسانے

☆

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد-۴ (اے-پی)

سنِ اشاعت : ۱۹۶۸ء
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

○

ملنے کا پتہ :
سب رس کتاب گھر
ایوانِ اردو ۔ خیریت آباد ۔ حیدرآباد ۔ ۴

○

مطبوعہ :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ۔ چارکمان ۔ حیدرآباد ۔ ۲

ڈاکٹر زورؔ کے نام

حامدی کاشمیری

فہرست

تعارف

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے سلسلۂ مطبوعات کشمیر کے نام سے کشمیر کے شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ اب تک اِس سلسلے کی تین کتابیں ' حرفِ شیریں ' ، بہنوں کی کہانیاں ' ، اور نیل کنول مُسکائے ' شائع ہو چکی ہیں۔ اب ڈاکٹر حامدی کشمیری کے افسانوں کا مجموعہ " برف میں آگ " شائع کیا جارہا ہے جو اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔

ڈاکٹر حامدی کشمیری دُنیائے علم و اَدب میں بحیثیت افسانہ نگار اور شاعر محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ بقول ڈاکٹر زور :

" یہ کشمیر کے جدید اُردو اَدب کی رنگارنگ شخصیت ہیں۔
وہ افسانہ نگار سے بڑھ کر شاعر ہیں اور شاعر سے بڑھ کر

افسانہ نگار۔ ان کے افسانے بھی شاعری کی نوک پلک سے
آراستہ اور شاعرانہ تیور سے معمور ہیں۔ چونکہ وہ پروفیسر بھی ہیں
اس لیے اُن کے کرداروں اور تکنیک میں فلسفیانہ لب ولہجہ
اور عالمانہ انداز نمایاں ہیں"۔

فاضل افسانہ نگار نے ان افسانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور سماج کی کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے اور انسانی جذبات واحساسات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ منظر نگاری، خیالات کی پاکیزگی اور الفاظ کی برجستگی ان افسانوں کی اہم خصوصیات ہیں۔

توقع ہے کہ اہلِ ذوق ان افسانوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھیں گے۔

مہندر راج سکسینہ
(معتمد عمومی ادارہ)

"ایوانِ اُردو"
حیدرآباد۔۲
۱۰ر جنوری ۱۹۶۸ء

حرفِ اوّل

جولائی ۱۹۶۲ء میں میرے کرم فرما مرحوم ڈاکٹر زورؔ نے اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کی طرف سے میرے منتخب افسانوں کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، اور مَیں نے احساسِ مسرت کے ساتھ نمایندہ جرائد میں چھپے ہوئے چند منتخب افسانوں کا مسودہ اُن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مرحوم اگست ۶۲ء میں گرمیوں کی چھٹیوں میں حیدر آباد تشریف لے گئے، اور وہاں مجموعے کی اشاعت کی منظوری لے لی۔ ڈاکٹر زورؔ نے سری نگر میں اپنے قیام کے مختصر وقفے میں یہاں کے نمایندہ ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، میری کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ مقامِ شکر ہے کہ یہ کتاب اب اِدارہ کی جانب سے شائع ہو رہی ہے۔

اس میں جو افسانے شامل ہیں، اُن میں، مَیں نے جدید انسان کی لمحاتی زندگی کی بعض جذباتی کشمکشوں اور نفسیاتی اُلجھنوں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ افسانہ نگاری کی صنف کے فنّی اور فکری امکانات زندگی کی بیکرانی کی طرح لامحدود ہیں، اور افسانہ نگار کا فنّی شعور جس قدر بالیدہ اور ہمہ گیر ہوگا، اسی قدر وہ ان امکانات کو اپنی گرفت میں لانے میں کامیاب ہوگا۔ کئی برس پہلے لکھے گئے ان افسانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوّری کرنے میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، یہ دیکھنا قارئین کا کام ہے۔

مَیں اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کے اربابِ اختیار کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں، جنھوں نے اس مجموعے کو محبت اور خوبصورتی سے شائع کرایا۔

۳۹۶۔ جواہر نگر، سری نگر (کشمیر)

ڈاکٹر حامدی کاشمیری
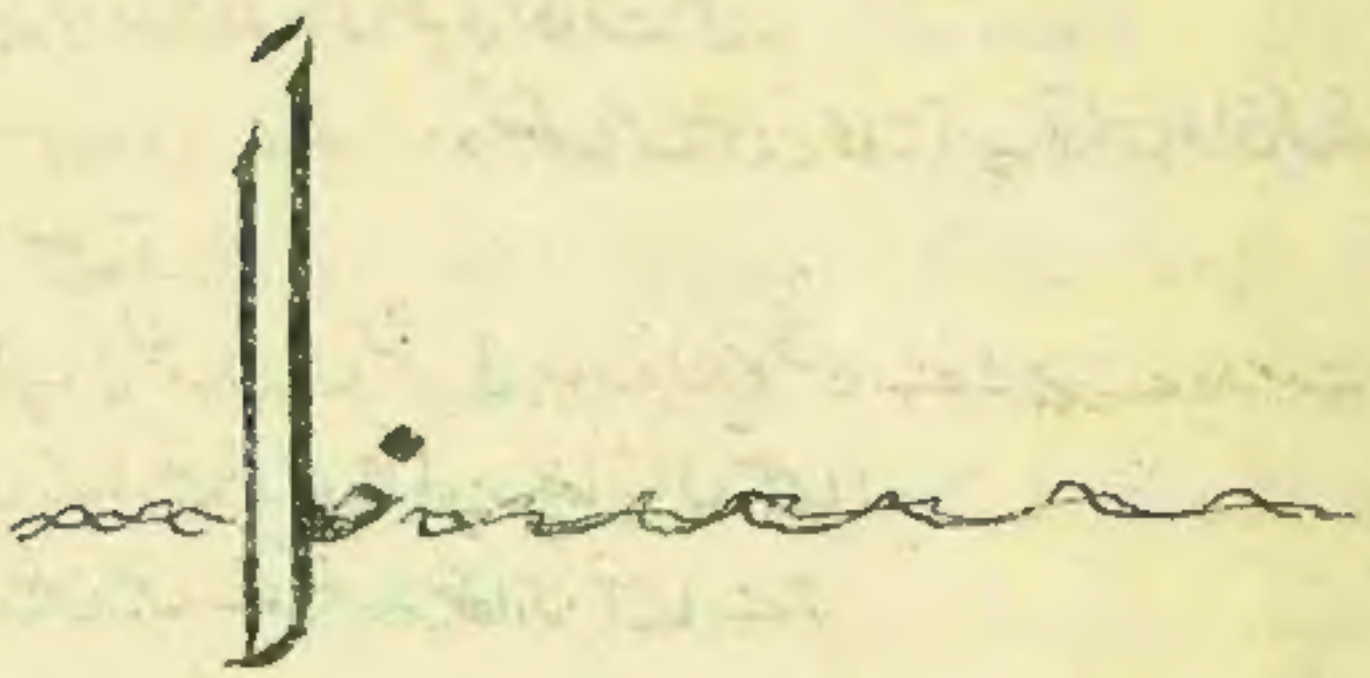
وہ رات کتنی حسین تھی۔

چاندنی کی ٹھنڈی سہانی روشنی میں رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ دُور لیڈیز ہوسٹل کی سفید چھت چمک رہی تھی۔ "تارناکہ" کو جانے والی پختہ سڑک انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ہم تینوں سڑک کے کنارے ایک بڑی سیاہ چٹان پر بیٹھے تھے۔ کماری تیز رنگ کی چھینٹ کا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ چاندنی اُس کے گول سیاہی مائل بھرے ہوئے چہرے کو دلکشی دے رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چاندنی اُتر آئی تھی۔ وہ اپنے مخصوص ترنم میں اپنی نئی انگریزی نظم سنا رہی تھی۔ نظم کیا تھی، محبت کے جذبات کی قوسِ قزح تھی۔ کنواری دھڑکنوں کا سنگیت تھا۔ اور کماری کے لب و لہجہ کی وارفتگی مجھے مسحور کر گئی۔ اس عورت کی روح میں کتنا گداز ہے۔ گداز اور حُسن! میں سوچ رہا تھا۔ اور میرا دوست اپنے لمبے لمبے ہاتھوں میں لمبی سی ٹھوڑی لئے ہوئے سارے ماحول سے بے نیاز تھا۔ شاید وہ اپنے خوابوں

کی وادیوں میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

"کماری! تم سنگیت کی دیوی ہو!"

میری آواز میں اُس نظم کی لطافت تھی۔

"NON SENSE" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔" آپ تو بس مذاق کرتے ہیں۔"

"نہیں تو!"

"آپ کی نظموں میں کشمیر کی بہاروں کا حسن ہے۔" میرے دوست نے کہا۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں!

"لیکن میں نے کشمیر دیکھا ہی نہیں ہے۔"

وہ مسکرائی۔

اُس کے دانتوں کی سفید لڑی نمودار ہوئی۔

"آپ نے دیکھا ہے راؤ ے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"میں نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن رمیش تیار نہ ہوا۔ اُس کے بغیر میں جانا نہیں چاہتی۔"

اُس کے لہجے میں اُداسی آگئی۔

کماری بات بات پر بچوں کی طرح بے باک قہقہے لگاتی۔ ڈنر ہال میں جب سب جمع ہو جاتے تو وہ سب سے زیادہ بشاش نظر آتی۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ چپ نہ رہ سکتی۔ کسی کے کھانے کے انداز میں عیب نکالتی۔ کسی کے لباس پر تنقید کرتی۔ کبھی چاؤ سے بتاتی کہ اُن کے گھر میں کیا کیا چیزیں پکتی ہیں۔ کبھی شیلے یا کیٹس کے شعر کہتی۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ انسٹی ٹیوٹ کے سارے لوگ اُس سے دُور ہی دُور سے دلچسپی لیتے تھے۔ اور میں تو اب اُس کی طبیعت

سے واقف ہو چکا تھا۔

جس دن ہم سب گولکنڈہ فورٹ دیکھنے گئے، وہ فورٹ کے اندر ہم دونوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں فورٹ کے بارے میں ماضی کے چند واقعات بیان کر رہا تھا اور کماری توجہ اور دلچسپی سے میری باتیں سُن رہی تھی۔ میرا دوست آگے آگے قدم اُٹھا رہا تھا اور کھنڈرات میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ اُس دن کماری کو میں نے قریب سے دیکھا تھا۔ اُس نے مجھ سے باتیں کیں۔ وہ چھبیسویں سال میں اپنا قدم رکھ چکی تھی۔ اُس نے بتایا وہ بمبئی کے ایک بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ اُس کا بھائی امریکہ میں ہے۔ اُس کے گھر میں بالکل آزادی ہے۔ روز اُس کے دوست ادیب، آرٹسٹ اور جرنلسٹ اُس سے ملنے آتے ہیں۔ اور وہاں خوب مزے سے گزرتی ہے اور اُس نے کہا۔

"مجھے ادیبوں اور آرٹسٹوں سے پیار ہے۔ میں اُن کی ہر ادا میں دلچسپی لیتی ہوں۔ جب میں نے آپ کو دیکھا میں فوراً سمجھ گئی، آپ بھی آرٹسٹ ہوں گے آپ ——— "

وہ شرمائی۔

اور میں سوچتا رہا۔

" آپ نہیں جانتے رائے! میں نے رمیش کے ساتھ کتنا وقت گزارا ہے جب میں چھوٹی تھی، وہ ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ بہت شریر تھا وہ مجھے پڑھنے نہیں دیتا تھا۔ میری چیزیں منتشر کر دیتا اور شام کو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر سیر کو لے جاتا ہم دونوں نے بی۔ اے ساتھ ہی پاس کیا۔ میں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا اور رمیش ملٹری میں کیپٹن ہو گیا۔ میں نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ وہ ملٹری

میں نہ جائے۔ لیکن ...... لیکن مجھے اس سے پیار ہے۔ اگر مجھے اس کا خط وقت پر نہیں ملتا تو میں پاگل ہو جاتی ہوں۔"

کماری جذباتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

وہ روز شام ہونے سے پہلے ہی ہمارے ہوسٹل میں چلی آتی۔ اور بڑی بےباکی سے ہمارے کمرے میں آتی۔ اس کے چلنے کے انداز میں رقص کی ایک ادا تھی۔ روز وہ نئے لباس میں نظر آتی۔

"EXCUSE ME"

وہ دروازے پر رُک کر کہتی۔

اور ایک شیریں قہقہہ لگا کر اندر آجاتی۔ اور کرسی پر بیٹھ جاتی۔

"کماری، ایک بات کہوں؟"

"ہوں؟"

"دیکھئے، آپ کا یہاں روز روز کا آنا اچھا نہیں، یہ لوگ باتیں بناتے ہیں!"

"چھی چھی! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ! میں ان لوگوں کی پابند تھوڑی ہوں۔ میں انسان ہوں، اپنے برے اور بھلے کو سمجھتی ہوں۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔

میں لاجواب ہو گیا۔

وہ جب بھی سنجیدگی سے کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی تو اس کے استدلال کے سامنے میری کچھ نہ چلتی۔ ایک بار جب میں —— فرائیڈ کی تائید میں ادب اور آرٹ کے اصلی محرک کی وضاحت کرتے ہوئے بہکنے لگا۔ تو اس نے ادب، نفسیات اور اخلاقی قدروں پر ایک لمبا لیکچر دیا۔ اور مجھے اس کے خیال سے اتفاق کرنا پڑا۔

"ہیلو مس کماری! گڈ ایوننگ!"

اِتنے میں میرا دوست آ ٹپکا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک نیلا لفافہ تھا۔ شاید اُس کی محبوبہ کا خط آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی بہار تھی۔

"شاید رمیش کا خط آیا ہو!" اچانک کماری بے قرار ہو اُٹھی پچھلے ہفتے بھی کوئی خط نہ آیا۔ آج تو ضرور آنا چاہیے۔ میں ذرا پہلے ڈاک تو دیکھ لوں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور کمرے سے باہر چل دی۔

اُس دن ہم دور تک تارنا کر روڈ پر چلتے رہے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ کماری نے نیلان کی ایک نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اُس کے گداز بازو عریاں تھے۔ اُس کی کھلی کمر اور شانے بالوں کے جھکے ہوئے گھنے سایوں میں چھپ گئے تھے۔

"اگر آج آپ نہ آتے، تو میں اکیلی ہی سیر کو جاتی۔ شام کی سیر میرا معمول ہے۔"

"لیکن اِس سنسان راستے پر اکیلے جانا ——"

میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ آپ نے شاید میری اُنگلیوں کے ناخن نہیں دیکھے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اور —— اور میں نے بے اختیار ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کتنا نرم ہاتھ ہے، جیسے گلاب کا پھول!"

"آپ تو شاعری کرنے لگے۔ ارے میں تو اپنے ناخن ——"

وہ رُک گئی۔ اور اُس نے بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اوہ سوری! اِیج ہے، پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے۔"

"مسٹر رائے، وقت آنے پر عورت شیرنی بن سکتی ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

اس کی بات میں کتنی سچائی تھی۔

میں نے اس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔ مجھے اس لمحے ایسا دکھائی دیا جیسے اس صحرا میں جنت کی کوئی مقدس حور اتر آئی ہو۔

"کماری، ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں ——"

"شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"شادی؟" وہ رک گئی۔ "میں، میں پہلے شادی کے بہت خلاف تھی لیکن اب میرا مطلب ہے جب سے رمیش ملٹری سروس میں چلا گیا، میرا خیال بدل گیا۔ رمیش میری دنیا میں انقلاب لایا۔ ہم رات گئے تک جوہو اور میرین ڈرائیو میں باتیں کرتے رہے۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے کبھی ادب کے موضوع کو پسند نہیں کرتا، لیکن وہ مجھے پھر بھی پسند ہے لیکن —— لیکن وہ کئی برسوں سے بمبئی نہیں آیا۔ خیر جانے دیجئے اِن باتوں کو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

شام کے بھیگے بھیگے سائے آ و تڑ رہے تھے۔

"تمہاری آنکھوں میں جادو ہے کماری!"

"جادو؟"

"تم ایک ساحرہ ہو!"

"ساحرہ ——— کیا مطلب؟"

"ساحرہ یعنی جادوگرنی ——— وِچ ———" میں اسکی سیاہ آنکھوں کے جادو کو محسوس کر رہا تھا۔

"ہاہا ——— !" وہ خوشی سے چلائی،

"کیوں؟"

"وہ بھی مجھے اِسی نام سے پُکارتا ہے۔ کیا میں سچ مچ ایسی ہوں؟"

"تم سچ مچ حسین ہو!"

میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں بھول گیا کہ میں نے اپنے دوست کے سامنے اقرار کیا تھا کہ وہ ایک بھدّی اور بدصورت عورت ہے!

اُس نے میری طرف شرمائی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھا۔

"سچ کہتا ہوں کماری جب سے تمہیں دیکھا ہے میں عورت کی عظمت کا قائل ہو گیا ہوں۔"

"NON SENSE" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی وائف سے ناانصافی کرنے لگے!"

"کبھی نہیں، بات یہ ہے کہ وہ ایک سیدھی سادی اَن پڑھ عورت ہے جیسی کہ ہماری عورتیں ہوتی ہیں لیکن آپ ———"

"لیجئے، آپ کے دوست آ گئے۔ اب اِن سے گیت سُنیں گے۔ ٹھیک ہے نا!"

چھٹی کے دونوں دن گزر گئے۔ ہم دونوں دو دن کے بعد اُس سے

ملنے جا رہے تھے۔ ہم نے باہر کے گیٹ کے اندر قدم رکھا۔ کماری برآمدے پر کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

ہم نزدیک آ گئے۔ کماری کے پیارے ماتھے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کے دو پھول تھے۔ اُس نے آتے ہی یہ پھول ہمیں پیش کر دیئے۔

"تعجب ہے۔ چٹانوں میں بھی پھول کھلتے ہیں!"

میرے دوست نے کہا۔

"ان پھولوں میں زیادہ خوشبو ہوتی ہے۔" وہ مسکرائی اور جلدی سے اندر گئی۔ اور نوکرانی کو چائے لانے کو کہا۔

ہم چائے پیتے رہے۔ اور کماری وہ نظم سنا رہی تھی جو اُس نے کل رات کو لکھی تھی۔

"میں بن سنور کے بیٹھی تھی، تمہارے لئے،
خوابوں کے دریچے پر، آنکھوں میں انتظار کی جلن لئے۔
بارش کے قطرے میرے دریچے سے ٹکراتے رہے۔
میرا دل دھڑکتا رہا۔
لیکن تمہارے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی نہ دی۔
کاش تم آتے!"
کاش رات کی پلکوں پر درد کے چراغ بجھ نہ جاتے!!"

یہ نظم سن کر میں ششدر رہ گیا۔

کماری کی آواز میں آنسوؤں کی تھرتھری تھی۔ واقعی اس نظم کے ہر لفظ میں اُس کی روح کی خلش تھی۔ لیکن یہ خلش کہاں سے آئی ہے؟

"میں روز اسی طرح آپ کا انتظار کرتی ہوں ـــــ کیا کروں میں جب، کسی کو اپنا دوست سمجھتی ہوں، میں ـــــ میں دل و جان سے آسے ـــــ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، آج باقی لیڈیز نے مجھے پکچر جانے کو کہا۔ لیکن میں نے کہا کہ مسٹر راٹے مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔ میں صاف صاف کہتی ہوں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ انسٹی ٹیوٹ میں کئی لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ لیکن میں ان کی کچھ پروا نہیں کرتی۔ جانے دیجئے ان لوگوں کو۔ ہر انسان کی اپنی انفرادیت ہے:"

میرا دل اس کی انفرادیت کی قوت کے آگے جھک گیا!

میرے دوست نے کہا۔

"اچھّا چلئے، اب سیر کو چلیں!"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"آج پکچر جائیں گے۔ ونڈرفل پکچر آئی ہے بالی ووڈ کی۔ ہم ضرور جائیں گے کیوں؟" اس کی ضد میں بچوں کی سادگی تھی۔

"آپ کی مرضی ہے تو چلئے۔"

مجھے اب اسے مایوس کرنے کی جرأت نہ تھی۔

ہم تینوں پلازا سینما چلے گئے۔

فلم دیکھ کر جب ہم ٹیکسی میں واپس آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ کماری خلافِ معمول خاموش ہے۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی لرزش تھی۔ اس کی آنکھوں میں شراب کی مستی تھی۔ جب ٹیکسی نے ہمیں تار ناکہ پر چھوڑ دیا تو میں کماری کو اس کے ہاسٹل تک چھوڑنے کے لئے ساتھ گیا۔ میرا دوست وہیں چوک پر سگریٹ پیتا رہا۔

"اچھا کماری، گڈ نائٹ!"

میں ہوسٹل کے گیٹ پر رک گیا۔

"رائے!"

کماری میرے سامنے کھڑی رہی۔

اُس کے سینے سے ساڑی ڈھلک آئی تھی۔ اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

اچانک وہ میرے بہت قریب آئی۔ اُس کی اداؤں میں جذبات کا تلاطم تھا

"کماری!!" میں سراپا حیرت تھا!

"رائے ——— مجھے، مجھے سہارا دو، میں ——— میں نہیں جانتی ———"

"لیکن رمیش ———"

"وہ میرے لئے مر چکا ہے۔ وہ مر چکا ہے رائے، میں پیار چاہتی ہوں، پیار ——— لیکن ———"

اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے اُبھرے۔

ایک لمحہ گزر گیا۔

میرے دل میں آیا کہ چلا کر کہہ دوں، تم ایک ذلیل عورت ہو۔ لیکن میرے کانپتے ہوئے ہونٹ کماری کے آنسوؤں کو چھو گئے ——— اُن آنسوؤں میں زہر تھا۔

اور ———

اور میں ایک پاگل کی طرح وہاں سے چلا آیا۔

دو برس پہلے جب کہ میں انجینئر کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ اور صرف چار مہینے پہلے شادی کے سلسلے میں دس روز کی چھٹی پر آیا تھا۔ آج میں دوسری بار یہاں آیا تھا۔ کیونکہ میرا تبادلہ یہیں اپنی جگہ پہ ہوا تھا۔ آج یوسف کو دیکھ کر اگر مجھے تعجب ہوا تو یہ قدرتی بات تھی۔

کافی کا ایک تلخ گھونٹ حلق سے اُتارنے کے بعد یوسف نے کچھ سوچ کر سگریٹ جلایا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اور میں پیالی سے اُٹھتی ہوئی ہلکی سی بھاپ کے پیچھے اُس کے چہرے پر اُبھرتی اور سکڑتی ہوئی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن لکیروں میں اُس کے جذبات کی تلخی گھل رہی تھی۔ میں گھبرا گیا اور میں نے اُسکی آنکھوں کی وسعتوں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں خاموش تھیں۔ خاموش اور پُرسکون۔ کتنا عجیب آدمی ہے؟! اس کے چہرے پر ذہنی پریشانی ہے۔ چہرے کی لکیروں میں نفرت اور بیزاری کے کتنے طوفان چھپے ہیں۔ اس کی باتوں میں زہر ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں کی خواب آلود گہرائیوں میں سکون ہے ——— اِس سے پہلی ملاقات تین سال پہلے پہلگام کی

شاداب وادی میں ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں انجینئرنگ کا ٹریننگ کورس ختم کرنے آیا تھا۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے اُس کی لاابالی طبیعت پسند آگئی۔ وہ ہمیشہ اپنے لباس سے بے پرواہ رہتا تھا۔ ہر وقت سگریٹ کے کش لیتا رہتا تھا۔ اُس کی باتوں میں خلوص اور درد تھا۔ اُس نے باتیں کرنے کا ایک دلنشیں انداز پایا تھا۔ جب بھی وہ ہوٹل کے برآمدے پر کھلی اور ٹھنڈی دھوپ میں مجھ سے باتیں کرتا۔ تو میں سارے کام بھول جاتا۔ باتیں کرتے کرتے وہ پہلگام کی خوب صورتی اور شادابی میں کیٹس کے پُرسوز اور خواب آور نغموں کے حُسن کی تلاش کرتا۔ کبھی وہ روزیٹی کے تخیل کے رنگ و نور کی طلسمی لہروں میں ڈوب جاتا۔ اور کبھی فراق کی عورت کے رنگ روپ میں کھو جاتا۔ اور میں سحر زدہ اُسے دیکھتا رہتا۔ میں شاعری سے ہمیشہ دُور بھاگتا تھا۔ میں شاعری کو خبط الحواس لوگوں کا دھندہ سمجھتا تھا۔ لیکن یوسف نے پہلی بار مجھے احساس دلایا کہ یہ میری اپنی کمزوری ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاعری رُوح کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے۔ اور احساس کی قوسِ قزح میں نکھرتی ہے۔

کبھی کبھی ہمارا موضوعِ گفتگو عورت ہوتی۔

"عورت کے بغیر زندگی بے معنی ہے"

یوسف ایک جذباتی لہجے میں کہتا۔

"عورت محبت کی دیوی ہے۔ وہ صرف محبت کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ صرف محبت سے جیتی جا سکتی ہے۔ محبت ہوئی تو سمجھو شادی بھی ہو گئی۔"

اور اُس کے خیالوں کی تان اِس جملے پر ٹوٹتی۔

"عورت ایک بار کسی کو چاہتی ہے تو ہمیشہ اُسی کی رہتی ہے"

اور جب میں اُس کے خیالات سے اختلاف کرتا تو وہ جھنجلا کر ایک نیا سگریٹ سلگا لیتا۔

فرصت کے وہ دن کتنے حسین تھے!

اور آج تین سال گزرنے کے بعد یوسف میرے سامنے بیٹھا تھا۔

جیسے تین سو سال گزر چکے تھے!

"انسان کتنا سخت جان واقع ہوا ہے دوست!" یوسف کہہ رہا تھا کافی ہاؤس میں ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ٹیبل پر ایک ملٹری آفیسر ایک خوب رو عورت کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔

"انسان میں چٹانوں کی سختی ہے۔ طوفان اُٹھتے ہیں۔ لیکن انسان زندہ رہتا ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لئے مجبور ہے۔ وہ فریب کھاتا ہے۔ اُمیدیں اُسے فریب دیتی ہیں۔ وہ زخم کھاتا ہے اور اُس کے ہونٹ مسکراتے ہیں"!

وہ رُک گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کسی فرانسیسی شاعر کی کوئی آزاد نظم سُنا رہا ہے۔ اُس کے لب و لہجے میں گداز تھا۔ درد اور آنسو تھے اُس کے چہرے کی لکیریں زیادہ گہری ہو گیئں۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں اب بھی سکون تھا۔

یہ سکون کیا ہے؟

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور نہ مجھے اُس سے کوئی اور سوال کرنے کی ہمت تھی۔ میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ سُناؤ بھئی! کالج میں کیسی گزرتی ہے؟ کیا پولٹری اب بھی تمہارا محبوب سبجکٹ ہے؟ اب تو تمہاری شادی بھی ہو گئی ہو گی سُناؤ بھابی کیسی ہے؟ اور ایسے ہی سوال وہ مجھ سے کرے، تو میں کہوں گا۔ لاکھ میں نے چاہا کہ اس بندھن میں نہ بندھ جاؤں۔ لیکن گھر والوں کو کون

سمجھائے انہوں نے میرے لئے ایک لڑکی دیکھ ہی لی۔ لڑکی کے بارے میں مجھے لکھا کہ اچھی "شکل وصورت کی ہے۔ گریجویٹ ہے۔ اچھے گھر کی ہے۔ اور اب تو شادی کو کئی مہینے ہو چکے۔ لیکن یہ شادی بھی مصیبت سے کم نہیں۔ کتنی ذمہ داریوں کا بوجھ کندھوں پر آ پڑتا ہے۔ دو اجنبی انسان ملتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل رہتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو شادی کیوں ہوتی ہے؟

میں ابھی خیالوں میں اُلجھ رہا تھا۔ اور یوسف کافی ہاؤس کی کھڑکی سے باہر بنڈ روڈ کے اُس پار کھلی سُرمئی فضاؤں میں کھو چکا تھا۔

وہ اُس دن بھی مجھے کافی ہاؤس میں ملا۔ کافی پی کر میں نے اُسے بنڈ روڈ پر چلنے کو کہا۔ وہ مان گیا۔ اور ہم چلتے رہے۔

شام کی نرم ہواؤں میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جہلم کی لہروں کے دامن میں شفق کے سُرخ پھول کھل رہے تھے۔ اور یوسف اپنی کہانی سُنا رہا تھا۔

یہ کہانی سُننے کے لئے جیسے میں برسوں سے بے چین تھا۔ ہم ایک درخت کی چھاؤں میں سبزے پر بیٹھے تھے۔

اُس کہانی میں ایک رومانی نظم کا جادو تھا۔ اُس میں کیٹس اور شیلے کی البیلی شاعری کا کیف اور رس تھا۔ اُس میں فراق کی عورت کے چھلکتے ہوئے جسم کی خوب صورتی تھی!

جہلم کی لہریں خاموش تھیں۔

دس برس سے وہ ایک لڑکی کو چاہتا رہا۔ وہ اُس کے خوابوں کی شہزادی تھی! اُسے زندگی کی لازوال مسرتوں کے خزانے مل چکے تھے۔ وہ لڑکی اُس کی

زندگی میں رنگ و نور کی ایک لہر بن کر اُبھر آئی تھی۔

اُس لڑکی کا نام حسینہ ہے!

حسینہ ——؟

اچانک کہانی میں ایک عجیب موڑ آگیا۔ میں چونک اُٹھا۔ جہلم کی لہروں میں تناؤ آگیا۔ میں نے ایک تیز نظر یوسف کے چہرے پر ڈالی۔ اُس کے چہرے پر سکون تھا اُس کے پتلے ہونٹوں پر کہانی کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔

یہ اُس کی اپنی حسینہ تھی!

اُس کی محبوبہ۔ اُس کی شاعری۔ وہ شاعری کے کیف اور رس میں ڈوب گیا۔ وہ حسینہ کے پیار کو پا چکا تھا۔

کہانی کے نقرئی تانے بانے سنور رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟"

"دو سال گزر گئے۔ میں دو سال بعد یہاں آیا۔ میرا تبادلہ ملک کے دوسرے حصے میں ہو گیا تھا۔ میں آیا، اور میں نے حسینہ سے مشورہ کر کے اُس کے گھر والوں کو شادی کا پیغام بھجوا دیا۔ لیکن اُنہوں نے شادی سے انکار کیا۔"

"انکار کیا؟"

"انسان خود غرض ہے رحمی" وہ توقف کے بعد بولا۔ خود غرضی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ ہماری لڑکی گریجویٹ ہے۔ یہاں چھوٹی سی جگہ ہے نا؟ لڑکی کا بی۔ اے ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ اُنہوں نے کہا ہم اِسے کسی بڑے آدمی سے بیاہیں گے۔ ایک پروفیسر کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ اور اُنہوں نے اُس کی شادی کسی انجینئر سے کر دی۔"

"انجینئر سے شادی کر دی؟"
میں بوکھلا گیا۔ جیسے کسی نے میرے سینے پر ایک گھونسہ مار دیا۔
"شادی ہو چکی ہے تو کیا ہوا؟ حسینہ میری ہے، وہ میری ہو چکی ہے۔ شادی روحوں کا اتصال ہے اور وہ اتصال ہمارے درمیان دس سال پہلے ہو چکا ہے جب ہم نے کالج لائبریری میں پہلی بار کھل کر باتیں کی تھیں۔ اور پھر ہم نے بہت سے لمحے ساتھ گزارے۔ ان لمحوں کا گداز میرے دل میں ہے۔ میں ان لمحوں کو جگر سے لگائے بیٹھا ہوں۔ ان لمحوں میں حسینہ کی کنواری سانسوں کی گرمی اور خوشبو ہے۔ ان لمحوں میں اس کی ریشمی، جھکتی ہوئی زلفیں میرے لئے خوابوں کی نرم آنچ لائی ہیں۔ میں نے اس کے ہونٹوں کے شہد کو روح کی گہرائیوں میں اتار لیا ہے۔ کون کہتا ہے وہ مجھ سے جدا کی گئی ہے؟ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ میں نے اسے پیار کیا ہے، وہ میری ہے۔ کون کہتا ہے اس کی شادی ہو چکی ہے ——"

"یوسف ——!"
میں چیخ اٹھا۔ "بند کرو یہ بکواس میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔"
میں غصہ اور نفرت میں اٹھ کھڑا ہوا۔
یوسف مجھے متعجب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں میں ایک معصوم بچے کی حیرت تھی۔ وہ خاموش تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔
میں نے بوکھلاہٹ میں جہلم کی طرف دیکھا۔ جہلم کی خاموش لہروں میں جیسے تلاطم آگیا۔ یوسف کی کہانی اس تلاطم میں ڈوب گئی۔
لیکن یہ تلاطم کہانی کا دوسرا رخ پیش کر رہا تھا۔
کیا حسینہ میری ہے؟ —— میرا ذہن چکرا رہا تھا!

وہ رسوئی سے باہر نکلی اور بڑے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی نظریں
سامنے دیوار پہ بڑے کلاک کی طرف اٹھیں۔ لیکن پہلی نظر میں اُسے کلاک کی سوئیاں
نظر نہ آئیں اُس کی دھندلی آنکھوں میں دھوئیں سے ہلکی سی نمی آ گئی تھی۔ دوپٹے
کے پلو سے اُس نے آنکھیں پونچھ لیں۔ دوبارہ کلاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بج
رہے تھے۔ راج ناتھ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ جوں ہی وہ آجائے تو وہ اُسے
بتائے گی کہ وہ کل ہی اپنی ماں کے پاس جائے گی۔ ابھی ابھی اُس کا چھوٹا بھائی
آیا تھا۔ اور وہ کافی اُداس تھا۔ دفعتاً اُسے یاد آیا کہ اُس نے دالان کی کھڑکی سے
باہر رسّی پر لٹکائے ہوئے کپڑوں کو ابھی تک نہیں اُٹھایا تھا۔ جنہیں سویرے ہی
اُس نے دھو کر پھیلا دیئے تھے۔ اور وہ جون کے آفتاب کی تمازت میں
کب کے سوکھ گئے تھے۔ وہ جلدی سے اوپر چلی گئی۔ اور جب وہ کپڑے
سمیٹ کر واپس کمرے میں آئی تو اُس نے دیکھا، راج ناتھ آ گیا تھا اور

ٹیبل کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور ایک تصویر کے سرورق کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ آگئے ہیں!"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔

اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ آگے بڑھ کر جلدی سے دھلے ہوئے کپڑے کھونٹی پر لٹکانے لگی۔ اس کے لئے چائے بھی تو گرم کرنی تھی ابھی۔

وہ کرسی سے اٹھ گیا اور اس نے اپنی بیوی کی طرف توجہ کئے بغیر دیوار پر لگی ہوئی چند تصویروں کو دیکھا۔ جو اس نے خود بنائی تھیں اور جنہیں اس نے ابھی تک کسی کو نہ دکھایا تھا۔ اس نے آرٹ کو کبھی سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ ہاں یہ ایک مشغلہ تھا اور بس! وہ ان خاکوں کو دیکھ رہا تھا اور کوٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس کے ہاتھوں سے کوٹ اور ٹائی لے لی۔ دونوں چیزیں متواتر استعمال سے اپنا رنگ کھو چکی تھیں۔ ہر روز یہی سوٹ پہنتا ہے وہ۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے ٹائی اور سوٹ کو ہینگر پر لٹکا دیا۔ راج ناتھ دیوار کے ساتھ چھوٹے سے ٹیبل کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور ایک ادھورے خاکے پر برش پھیرنے لگا تھا۔

وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ اور جلدی سے سماوار میں کوئلے ڈال کر آہستہ آہستہ پھونکنے لگی۔ اور تھوڑی دیر میں گرم چائے کی ایک پیالی لے کر مسکراتے ہوئے اندر آگئی۔

"چائے پی لیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے!"

لیکن وہ تصویر میں رنگ بھرنے میں کھو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر

پسینے کے کئی قطرے چمک رہے تھے۔ اُس کی گرد آلود دبیز عینک پر پسینے کے قطرے پھیل کر چھوٹے چھوٹے دھبّے بن چکے تھے۔

"پہلے چائے تو پی لیجئے!"

وہ پھر بولی۔

اُس کے لہجے میں اکتاہٹ اور بیزاری تھی۔ سوچنے لگی، یہ بھی کیا طریقہ ہے کہ ابھی گھر میں قدم نہیں رکھا کہ لگے ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنانے۔ کیا رکھا ہے اِس میں؟ وقت نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر اِس میں ایسی کیا بات ہے کہ آدمی کھانا پینا ملک بھول جائے۔ اور ——— اور کسی سے آدھے منھ بات بھی نہ کرے۔

"اوہ! ——— تم چائے لائی ہو؟" اُس نے چونک کر کہا۔ "عجیب ہو تم بھی مجھ سے پوچھا تک نہیں!"

"اِس میں کیا پوچھنا تھا؟"

"بھئی میں چائے پی چکا ہوں۔ تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی!"

"تکلیف! ——— لیکن آپ نے کہا بھی نہیں۔"

"ونڈر فل! بھئی اگر میں کہنا بھول گیا تو تم نے خود سوچا ہوتا۔"

اور اُس نے کہنا چاہا، وہ کسی کے دل کی بات کیسے جان سکتی ہے؟ لیکن وہ چپ رہی اور واپس جانے لگی۔

"ارے سنو تو!" وہ مسکرایا۔

"کیا ہے؟"

"بھئی وہ مجھے آج پھر مل گئے، ہم نے ساتھ ہی چائے پی!"

"کون ———؟"

"ارے وہی پروفیسر صاحب۔ جن کے بارے میں پچھلے ہفتے کہا تھا۔ ونڈرفل آدمی ہیں۔ بس کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ صرف کافی پیتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بڑی اپیل ہے۔ بس خاموش بیٹھے ہیں۔ اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ بہت پیارا آدمی ہے۔ اور سنو، وہ پرسوں اتوار کو یہاں آرہے ہیں۔ میں نے چائے پر بلایا ہے اُنہوں نے WORD دے دیا ہے۔ میرے آرٹ کے کچھ نمونے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو ٹال دیا تھا۔ لیکن وہ مانتے نہیں۔ اور ہاں، بہت اچھی چائے بنانا اُس دن۔"

"اُس دن ــــــــ؟!"

"ہاں! وہ پرسوں ضرور آرہے ہیں!" وہ کہے جا رہا تھا۔

"لیکن میں پرسوں ماں کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ اُس کی حالت خراب ہے!۔ آج ــــــ"

"ونڈرفل! میں وہاں جانے سے کب روکتا ہوں تمہیں۔ بس ایک دن کا فرق ہے۔ اتوار نہ سہی، سوموار سہی۔ مہمان کوئی روز روز آتے ہیں؟"

وہ اُسے اِس طرح سمجھا رہا تھا جیسے ایک اُستاد ایک کُند ذہن بچے کو سمجھا رہا ہو!

"لیکن پیکی وہ معقول ہے ــــــ"

"پھر وہی بات ــــــ"

اُس کے چہرے پر کئی شکنیں سمٹ کے آگئیں۔ جب بھی اُس کے جذبات میں ذرا تلخی پگھل جاتی! اُس کے چہرے پر لکیریں پھیل جاتیں۔ اور اُس کا چہرہ بانک ہو جاتا۔

"پیکی میں جو کہتا ہوں تم سمجھتی کیوں نہیں۔ بس بچوں کی طرح ضد کرتی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ برش ہاتھ میں لے کر پھر تصویر کے خدوخال اُبھارنے لگا۔ اور وہ اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ایک آہ اُس کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی۔ اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اور اُس نے نفرت اور غصّے سے بھری ہوئی ایک نظر شوہر پہ ڈالی اور کمرے سے نکل گئی۔

اتوار کو پروفیسر صاحب آ گئے۔

وہ بڑے کمرے میں راج ناتھ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ اور آرٹ اور اُس کی مقصدیت پہ اظہار خیال کر رہے تھے۔ راج ناتھ کہہ رہا تھا "آرٹ کا کوئی مقصد نہیں۔ مقصد آرٹ کا خون کرتا ہے" وہ اُسے اپنے کئی خاکے اور تصویریں دکھا چکا تھا ادھر شوبھا چائے تیار کر کے اور چائے کا سامان درست کر کے اب اپنے لہراتے ہوئے ریشمی بالوں کو لپیٹ رہی تھی۔ لیکن اُس کا خیال اپنی ماں کی طرف تھا۔ اُس کے احساس کو کچوکے لگ رہے تھے۔ آج سویرے سے اُس کے دماغ میں عجیب عجیب اور ڈراونے خیال آ رہے تھے جیسے اُس کی ماں مر گئی اور اُس کی ارتھی۔ . . . . . اُف! کتنا منحوس خیال ہے۔ کون جانے آج اُس کی کیا حالت ہو گی؟ نہ جانے وہ اِس کے متعلق کیا سوچتی ہو گی۔ کتنی پتھر دل ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے اِس کا۔ دو ہفتے گزر گئے اور میری خبر تک نہ لی۔ لیکن اُسے کون سمجھائے، یہ بات نہیں، یہ مجبور ہے، بے بس ہے۔ وہ ایک عجیب آدمی ہے۔ تمہیں نے تو آنکھیں بند کر کے اُسے اِس تاریک اندھیرے کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ اور آج اُس کا دوست آ گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نہ جانے کون شریمان ہیں یہ! اِس کے برے کرموں کی سزا بن کر آئے ہیں۔

"ارے تم کھڑی کیا سوچ رہی ہو، چائے کا کیا ہوا؟" ——
راج ناتھ دروازے پر رک کر بولا۔ اس کے چہرے پہ ہلکی سی شگفتگی تھی۔

"بس چائے تیار ہے بالکل!"

"تو چلو!"

"ابھی آئی۔ آپ جائیے تو۔ مہمان کو تنہا چھوڑ دینا اچھا نہیں۔"

اور چند لمحوں کے بعد وہ چائے لے کر اندر آئی۔ شرماتی ہوئی اور سر جھکائے ہوئے۔ اس نے چھوٹی سی ٹی پائی پہ پیالیاں رکھ دیں اور پھولے سے دہکتے ہوئے سماوار سے چائے انڈیلنے لگی۔

"دیکھئے پروفیسر صاحب! کیا ونڈرفل چائے بنی ہے آپ کافی کو بھول جائیں گے۔ اوہ میں تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ ہیں میری پتنی شوبھا۔ اور، اور آپ ہیں پروفیسر ——"

"کیشور ——!" وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"شوبھا ——!" اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"ونڈرفل! آپ تو پہلے ہی سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"
راج ناتھ نے قدرے بوکھلا کر کہا۔

"جی ہاں کیشور صاحب اور میں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔"
شوبھا نے کیشور کو خاموش دیکھ کر خود ہی کہا۔ وہ بہت مشکل سے کہہ سکی۔ اس کا دل ابھی تک بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"OH I SEE"

راج ناتھ نے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کیشو صاحب! آپ چائے پینا ہی بھول گئے۔ یہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"بس ابھی پیتا ہوں۔"

کیشو نے قدرے چونک کر کہا۔ جذبات کی قوسِ قزح بن کر اُس کے چہرے پر کئی رنگ اُبھرے۔

شوبھا اُس دن شام تک گُم صُم بیٹھی رہی۔ ماضی کی یادیں اُس کے ذہن پر یوں اُبھر رہی تھیں جیسے کسی جھیل میں کنول کے پھول کھلتے ہیں۔ کیشو راج کا ایک خوش رو، حسین قامت نوجوان جو "ڈبیٹنگ کلب" کا سکریٹری ہونے کے علاوہ میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اور ساری لڑکیاں جس کی باتیں کرتی تھیں۔ کوئی اُس کے جسم کی تعریف کرتی، کوئی اُس کی خوش گفتاری کی۔ اور کوئی اُس کی خوبصورت آنکھوں کی۔ لیکن وہ کبھی اُس کے بارے میں کچھ نہ بولی تھی۔

ایک دن جب وہ لائبریری کے ریڈنگ روم میں جا بیٹھی تو وہاں کیشو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔

اُس نے سوچا فوراً اُٹھ کر چلے جانا مناسب نہ ہوگا۔ ورنہ کیا خیال کرے گا وہ اُس کے متعلق۔ تھوڑی دیر "السٹریٹیڈ ویکلی" کی ورق گردانی کرکے جب وہ اُٹھی تو وہ بھی اُٹھا اور سامنے آگیا۔

"سُنئیے تو!"

وہ رک گئی۔

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ میگزین کے لئے کیوں کچھ نہیں لکھتیں؟"

پہلے بھی دو بار نوٹس کرائی گئی یہ بات، آپ ضرور اس بار کچھ لکھیئے۔ اور دوسری لڑکیوں سے بھی لکھوائیے۔"

وہ آنکھیں جھکائے ہوئے ایک دلنشین اور متین انداز میں کہہ رہا تھا۔

وہ بے حد متاثر ہوئی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ ایک کشش تھی۔ ایک جادو تھا۔

دوسرے ہی دن وہ بہت محنت سے لکھا ہوا ایک آرٹیکل لے آئی اور کشور کو دے گئی۔ کشور نے شکریے کے ساتھ لے لیا اور وہ بے حد خوش ہوئی۔

"آپ تو کالج کی لڑکیوں کی لیڈر بن گئیں۔" کشور سبزے کے مخملیں فرش پر بکھرے ہوئے انار کے شگوفوں سے کھیلتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔

"وہ کیسے؟" ہوا کے شریر جھونکے رہ رہ کر اس کے چمکتے ہوئے بالوں سے گلابی رنگ کا دوپٹہ سرکا رہے تھے۔

"آپ کا آرٹیکل چھپ گیا۔ اور اب سب لڑکیاں دھڑا دھڑ مضامین لکھ رہی ہیں۔"

اس کی خوبصورت آنکھیں مسکرائیں۔

"اوہ! یہ بات ہے!"

"اور سنیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بار ڈبیٹنگ کے سالانہ مقابلے میں ضرور حصہ لیں۔"

"لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ کو ضرور حصہ لینا ہوگا۔ میں نے آپ کا نام پہلے ہی پروگرام میں چھپوا دیا

ہے!"

"تو آپ ہی میری طرف سے بولیں گے بھی!" وہ ہنسی۔

اور کیشور چپ ہو گیا۔ شاید وہ اُس ہنسی کے خلوص اور بے تکلفی سے متاثر ہو گیا تھا۔

"دیکھئے، میں سچ کہتی ہوں؟ وہ متانت سے بولی۔ بولنے میں کوئی حرج نہیں لیکن آپ کی مدد کے بغیر، میرا مطلب ہے، جب تک آپ مجھے MAIN POINTS نہ بتائیں گے، میں . . . ."

"یہ بھی کوئی بڑی بات ہے؟ یہ تو میں نے پہلے ہی سوچا ہے۔"

"آپ نے تو سب کچھ پہلے ہی سوچ کر رکھا ہے!" وہ جذباتی ہو کر بولی۔ اُس کے کنوارے رخساروں پر ہلکی سی گلابی اُبھر آئی۔ اور اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

کیشور یہ سن کر چونک اٹھا۔ جیسے وہ بیداری کی ایک حسین جنت میں آ گیا جہاں قدم قدم پر خوابوں کے پھول تھے۔ خوشبو تھی، رنگ تھے۔ وہاں سب کچھ تھا اُس کی آنکھیں آئینہ تھیں۔

دن گزرتے رہے۔

اور وہ ایک بار تین ہفتوں تک کیشور سے نہ مل سکی۔ وہ کتنی بے قرار رہی کیشور اُس سے ملنے کے لئے نہیں آتا۔ اور کئی بار پہلو بچا کر نکل گیا۔ وہ کتنی پریشان ہوئی آخر اُس دن تھرڈ پیریڈ کے بعد وہ باغیچہ گارڈن میں چلی گئی۔ اور وہاں اسے کیشور ملا۔ وہ اُس سے خفا تھا۔ اُس کی خفگی کتنی سخت تھی! اُس نے کافی اصرار کے بعد بتایا کہ ایک دن گرلز روم سے گزرتے ہوئے سب

لڑکیوں نے اس پر قہقہہ لگایا تھا۔ اور اس کا قہقہہ بھی ان میں شامل تھا۔ یہ سُنکر وہ کتنی ہنسی۔ اصل میں وہ لڑکیاں ایک نئے پروفیسر کو دُور سے آتے دیکھکر ہنسی تھیں۔ جو لیکچر دیتے ہوئے ہر جملے کے ساتھ

UNDERSTAND, YOU SEE کا دُم چھلّا لگا لیتا۔ اور پھر جب وہ بھی ہنس دیا تو اس نے کہا کہ اب وہ تعلیم کو آگے جاری نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اس کی شادی کی بات پکّی ہو رہی ہے۔

یہ سُن کر وہ اچانک چپ ہو گیا۔

وہ خاموش رہا۔ جیسے اس کے ہونٹ سِلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تلخیوں کے گہرے سائے پھیل گئے۔

اور جب وہ جانے لگی تو کیشور بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"میں پہلے ہی جانتا تھا شوبھا!" وہ اداس لہجے میں کہنے لگا "ایک دن ہمیں جدا ہونا پڑے گا۔ مجھے تعجّب ہے کہ کسی نے تمہیں میرے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ لو سنو، ہم ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے۔ میرا باپ چپراسی تھا۔ اور اب پنشن پا رہا ہے ہمارے سماج میں چپراسی کی کوئی عزّت نہیں۔ حالانکہ وہ زیادہ محنت کرتا ہے، خیر، اور ہاں! تمہارے گھر والے، انہیں تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور تمہیں نہیں معلوم شوبھا! میرا باپ تمہارے باپ کے آفس میں چپراسی تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن، لیکن میں عجیب سا آدمی ہوں۔ ایک معمولی بات بھی SERIOUSLY لیتا ہوں۔ میں زندگی بھر تمہیں بھول نہیں سکتا میں تمہیں کبھی بھول نہیں سکتا!"

وہ رُک گیا۔

اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔

اُس کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔

اور اُس کی شادی ہو گئی راج ناتھ کے ساتھ۔ وہ اُس کے گھر والوں کا انتخاب تھا۔ راج ناتھ ایک آفس میں آفیسر تھا۔ وہ ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ تھا اُس کے والد نے اُس کے لئے کافی جائداد چھوڑی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ بھی تھا۔ یہ سب کچھ اُسے ماں نے بتایا تھا۔ اور وہ چپ چاپ سنتی رہی اُس کے ہونٹوں پر حرفِ شکایت بھی نہ تھا۔

اور اب سسرال میں اپنے پتی دیو راج ناتھ کے ساتھ رہتے ہوئے اُسے دو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ پہلے پہلے وہ اپنی نئی زندگی کے ساتھ آئی ہوئی نئی ذمہ داریوں اور نئی مجبوریوں کو دیکھ کر جھنجلائی۔ جھلّائی اور روئی۔ اُسے اپنے پتی دیو کی صورت دیکھ کر وحشت ہوتی۔ اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔ اور اُس کے خیالوں میں کِشور کی تصویر اُبھر آتی۔

"کِشور ——— کِشور ———!"

وہ چیخنا چاہتی۔ لیکن اُس کی چیخ ایک گھُٹی ہوئی آہ میں ڈھل جاتی۔ وہ تلملا اُٹھتی ———!

اور کتنا وقت گزر گیا ———

وقت گزرتا ہے۔ اور دل کے زخم بھر جاتے ہیں ———!

وہ اپنی بے چینی کو بہلانے کے لئے گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ وہ نوکر سے صرف بازار سے چیزیں لانے کو کہتی۔ خود ہی کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی۔ کمروں کی صفائی کرتی۔ اور دوسرے چھوٹے بڑے کام کرتی۔ اور اس طرح اپنے آپ کو بھول جاتی۔

اور آخر وہ اپنے ماضی کو بھول گئی۔
زخموں کو بھول گئی ـــــــــــ کیشور کو بھول گئی!
وہ اپنے ماضی کو دفن کر چکی تھی۔
وہ اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی!
ـــــــ لیکن آج کیشور اُس کے سامنے تھا، ایک پروفیسر بن کر!
اور اُس کی زندگی کا ماضی زندہ ہو کر اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ اُس کے زخم ایک بار پھر کھل چکے تھے۔ پھولوں کی طرح!
بے چینی میں جلدی سے اُس نے سوئچ آن کیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ وہ چند برتنوں کو صاف کرنے لگی۔ لیکن اُس کا دل کیوں کانپ رہا تھا؟ اُس کے خیالوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کیوں تھی؟

اُسی ہفتے راج ناتھ نے اُسے بتایا، کہ اگلے اتوار کو پھر پروفیسر کیشور آ رہے ہیں۔ وہ یہ سُن کر دھک سے رہ گئی۔ اور راج ناتھ نے ایک پُرمعنی نظر اُس کے چہرے پر ڈالی۔
اور پھر پروفیسر صاحب کبھی کبھی آتے رہے!
ایک دن جب کہ وہ دونوں کا انتظار کر رہی تھی، اُس نے دیکھا، کہ صرف کیشور آ رہا ہے۔ اُس کا پتی کہاں ہے؟ کیشور اکیلا کیوں آیا؟ اُسے نہیں آنا چاہئے تھا۔ اُف! وہ کیوں اُس کے گھر آتا ہے؟
اور کیشور نے اُسے بتایا کہ راج ناتھ نے اُسے اپنے فون پر بتایا تھا کہ وہ پورے پانچ بجے...... مکان پہنچے۔ وہ وہاں منتظر رہے گا۔ وہ ابھی تک نہیں آئے نہ جانے کیا بات ہے؟

"کیشور صاحب ——— !" شوبھا نے ماحول پر چھائی ہوئی گمبھیر خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"کہیئے!" کیشور نے خواب ناک آواز میں کہا۔

"آپ نے بھابی جی سے نہیں ملایا۔ کبھی اُنہیں یہاں ساتھ لائیے۔" وہ دل پر پتھر رکھ کر بولی۔ ایک رسمی انداز میں۔

"شوبھا دیوی! میں نے شادی نہیں کی ہے" ——— اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ گمبھیرتا تھی۔ "آپ کو معلوم نہیں، میں عجیب سا آدمی ہوں۔ معمولی باتوں کو بھی SERIOUSLY لیتا ہوں میں نے شادی نہ کرنے کا عہد کیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" اُسے محسوس ہوا' جیسے دھرتی گھوم رہی ہے۔

"زندگی میں، میں نے ایک لڑکی کو چاہا ہے۔" اُس کے لہجے میں زہر کی تلخی تھی۔ "وہ میرے سپنوں میں اُلجھی ہے۔ یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے لیکن میرے لیئے یہ واقعہ ہمیشہ تازہ رہے گا۔ اور ہاں سماج نے اُس لڑکی کو مجھ سے چھین لیا۔ لیکن کیا وہ واقعی مجھ سے چھین لی گئی ہے؟ نہیں ——— یہ غلط ہے۔ وہ آج بھی میری ———"

"کیشو ——— بابو ——— !" وہ پکار اُٹھی

"سوری! ——— میں کچھ بہت بہک گیا۔ شوبھا! جاؤ تم جلدی چائے لے آؤ۔ اور کچھ پراٹھے بھی لے آؤ۔ بھوک ایسی لگی ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ آپ کو بھی تو بھوک لگی ہوگی پروفیسر صاحب؟"

آج ناتھ بے ترتیب جملوں میں کہہ رہا تھا۔ اور کیشو۔ اور شوبھا دونوں کی بدحواسی کا جائزہ لے رہا تھا۔

اُس رات شوبھا کو ایک لمحے کے لیئے نیند نہ آئی۔ رہ رہ کر کیشور کے

الفاظ اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ اُف! کیا یہ ایک حقیقت ہے؟ کیا کیشور نے سچ مچ شادی نہ کرنے کا عہد کیا ہے؟ کیسا آدمی ہے کیشور، وہ اپنی زندگی کو تباہ کر لے گا۔ اور ساتھ ہی اب اُس نے اُس کی زندگی میں بھی زہر گھول دیا ہے۔ اور اُس کے اطمینان اور سکون کو چھین لیا ——— آف اُس کے لہجے میں کتنی تلخی تھی، کتنی سچائی تھی۔ ایک ایک لفظ اُس کے دل کو زخمی کر گیا۔ اُس کے چہرے پر کتنی ویرانی ہے، کتنی اداسی! کاش! اُس کی اُداسی دُور ہو جاتی۔ کیا وہ اُس کی اُداسی کو دُور نہیں کر سکتی؟ ——— وہ اب بھی کیشور کو چاہتی تھی۔ اپنے کلیجے کی پوری طاقت سے! ورنہ وہ کب اُسے بھول چکی تھی؟ وہ کیسے اُسے بھول سکتی ہے؟ ——— کیا وہ اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی؟ ——— وہ اُس کے لئے کر بھی کیا سکتی ہے؟ وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ زیادہ بے بس ہے ——— زیادہ مجبور ہے، زیادہ کمزور ———!

اور اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا دم گھٹ رہا تھا ———!

اور پھر کئی ہفتوں کے بعد کیشور اُن کے گھر آیا۔ راج ناتھ کہیں باہر گیا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے رہے۔ آج وہ اُسے دیکھ کر کتنی خوش ہوئی تھی۔ کاش وہ روز اُس کے پاس آ جاتا۔ اُسے کتنا سکون مل جاتا۔

"میں سوچتا ہوں شوبھا دیوی!" کیشور قدرے رُک کر بولا "جب سے تمہیں دیکھا ہے، میری حالت عجیب سی ہو گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہئے۔ لیکن مجھے بھروسا ہے کہ آپ مجھے معاف کریں گی ——— انسان کبھی کبھی بے بس ہو جاتا ہے۔ شوبھا! میں تمہیں اب بھی اُسی طرح چاہتا ہوں۔"

"کیشور بابو!" ——— وہ زور سے گرج اُٹھی "کس مُنہ سے آپ ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ میں اُن کی ہو چکی ہوں، وہ میرے دیوتا ہیں۔ دھرم اور سماج نے مجھے اُن کی بنایا ہے۔ میں دھرم، اور سماج کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں ایسی بے ہودہ باتیں نہیں سُن سکتی۔ آپ میرا اَپمان کر رہے ہیں۔ آپ یہاں سے جائیے۔ ابھی اسی وقت ——— !"

"میں خود ہی جا رہا ہوں شوبھا دیوی!" ——— اُس کے لہجے میں اطمینان تھا۔ جھلاہٹ نہ تھی ——— "صرف آپ کے گھر ہی سے دور نہیں، اِس شہر سے دور! ——— میں یہاں رہ کے اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی تلخ اور تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے یہاں سے دور، بہت دور ٹرانسفر کرا لیا ہے میں آج آپ سے رخصت ہونے آیا تھا ——— اچھا نمستے ——— !"

اور جب وہ چلا گیا تو وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کئی لمحے گزر گئے ——— ویران اور اُداس لمحے! جیسے کسی سُنسان رات میں کسی بیوہ کے دل کی بھٹکی ہوئی آہیں!

اِتنے میں راج ناتھ گنگناتے ہوئے اندر آ گیا۔

"ارے تم رو رہی تھیں؟"

"نہیں تو!"

وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھال کر اُٹھنے لگی۔

"ونڈرفل!!" ——— وہ کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ اُس کے لہجے میں طنز کی ایسی نشتریت تھی کہ شوبھا کی رُوح چھلنی ہو گئی۔ اور اُسے یکدم احساس ہوا

جیسے راج ناتھ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کیسے؟ وہ تو ابھی آیا۔ اور کیشور تو پہلے ہی گیا ہے۔ کہیں کیشور اُسے راستے میں تو نہیں ملا؟ کہیں کیشور نے اُسے ساری کہانی تو نہیں سنائی؟ —— نہیں، وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔

وہ باہر جانے لگی۔

"کہاں چلیں حضور؟!"

لہجے میں وہی طنز تھا۔

وہ رُک گئی۔ اُس کی پیٹھ راج کی طرف تھی۔ اُس کے دل میں راج ناتھ کے خلاف نفرت کی تیز لہر دَوڑ گئی۔

"بیٹھو، تھوڑی دیر کے لئے۔ تناؤ پروفیسر صاحب سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"میں بھی کتنا احمق ہوں۔ وہ کہنے کی باتیں تھوڑی ہیں!"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اُس نے فوراً پلٹ کر عجیب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں!"

راج ناتھ کا لہجہ اچانک سخت اور سنجیدہ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ بے شمار چہروں سے بھر گیا۔

وہ کانپ اُٹھی۔

"میں جانتا ہوں تم کیا ہو۔ میں اُسی دن جان گیا تھا، جس دن کیشور پہلے پہل یہاں آیا تھا —— تمہارے یہ آنسو —— ہا ہا ہا۔۔ تم سب مجھے دھوکا دے کر —— "

"بس کیجئے، بھگوان کے لئے۔ میں آگے کچھ نہیں سن سکتی۔"

"ٹھہرو ——— ! تمہیں سب کچھ سننا ہوگا۔" ——— وہ کڑک کر بولا ——— تم میری آنکھوں میں دھول جھونک کر کشور سے ——— "

"کشور سے پیار کرتی ہوں۔ کشور کو چاہتی ہوں ——— یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟"

اچانک اُس کے تیور بدل گئے۔

اب وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی تھی ——— !

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، سچ ہے ——— کشور کو میں ضرور چاہتی ہوں۔ کشور کو کوئی میرے دل سے نہیں نکال سکتا ——— آپ بھی نہیں کوئی بھی نہیں ——— کوئی بھی نہیں۔"

وہ زور زور سے کہہ رہی تھی۔

چیخ رہی تھی۔

اُس کی آواز میں شعلے لپٹے تھے۔

اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا ——— !!

اور دوسرے لمحے وہ منھ کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

وہ سسک رہی تھی ——— !

اور راج ناتھ متوحش اور پریشان نظروں سے منھ کھولے ہوئے بت کی طرح ساکت رہ گیا تھا ——— !!!

——— ٭ ——— ٭ ——— ٭ ———

اُس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا۔ کتنا میٹھا اور ٹھنڈا پانی ہے
اس کی روح کی گہرائیوں میں شبنم کی ٹھنڈک اتر گئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ
آنکھوں میں تازگی آگئی۔ اس کے عنابی ہونٹ بھیگ گئے۔ اور ہونٹوں کے
باریک خموں میں نمی جھلکنے لگی۔ اس نے گلاس سامنے گرد آلود ٹیبل پر رکھ دیا۔
ریسٹ ہاؤس کے اس چھوٹے سے کمرے میں شام کے ہلکے سائے پھیل رہے
تھے۔ اور سامنے کے دریچے پر سورج کی لرزتی ہوئی کرنیں سنہری جال بُن
رہی تھیں۔

"چائے منگائیے گا۔ بس ایک منٹ میں چائے آئے گا۔ چائے پی
لیا۔ ساری تھکاوٹ غائب!"

ریسٹ ہاؤس کا بوڑھا چوکیدار بشاشت سے بولا۔

"اچھا لے آؤ!"

وہ بیٹھی رہی۔

اکیلی اور خاموش۔

معاً اُسے محسوس ہوا کہ اُداسی کا ایک گھیر لمحہ اُس کے پہلو سے سرسراتے ہوئے گزر گیا۔ یہ لمحہ غم کی پرچھائیوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ لمحہ اچانک کہاں سے آیا تھا؟ جب سے وہ دہلی سے روانہ ہوئی تھی مسرور تھی۔ اُس کے دل سے اداسی کی دُھند چھٹ گئی تھی۔ اُس کے سینے میں حسین آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ اُس کے رسیلے ہونٹوں پہ بہاروں کے گیت مچل رہے تھے۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں میں کنول کھل رہے تھے۔ وہ پٹھانکوٹ سے ٹورسٹ بس میں سفر کرتے ہوئے بے چین ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد ان سپنوں کی سرزمین اور مقدس وادیوں میں قدم رکھنا چاہتی تھی۔ راستے میں کشمیری نوجوان نے وادیوں کے فردوسی حسن کا بار بار ذکر کیا تھا اور اس کی سیاہ آنکھوں میں بے تابی کی چمک آگئی تھی۔ مسٹر سنہا اور اُن کی بیوی کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد بانہال کے پہاڑی راستے کے پیچ و خم کو چھوڑنا چاہتے تھے اور بہاروں کے دیس میں ہنی مون منانا چاہتے تھے۔ وہ دونوں بھی اب ریسٹ ہاؤس کے دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

وہ دونوں۔ ——؟

اچانک اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

اُس کی طبیعت گھبرا اُٹھی۔

اُسے تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ وہ اتنی بڑی دنیا میں اکیلی تھی۔ اکیلے پن کے اس احساس نے اُس کی رُوح میں گھاؤ پیدا کر دیئے تھے۔

کون واقف تھا اس سے؟

اس کا خاوند ——؟؟

اُس کے ہونٹوں پر زہر خند آگیا۔ خاوند کا خیال آتے ہی اُس کی روح میں گھٹن سی محسوس ہوتی۔ وہ تلملا اُٹھتی۔ ایک رُوکھا پھیکا، خاموش اور سرد مزاج آدمی جس نے گرد و پیش کی زندگی اور انسانوں سے الگ رہ کر دفتر کی اکاؤنٹس فائلوں کے انبار میں اپنی دنیا بسائی ہے۔ رات دن اکاؤنٹس کا کام اور بس، دنیا میں انقلاب آرہے ہیں۔ انسان چاند پر کیوں کمندیں ڈال رہا ہے؟ دوستوں، رشتہ داروں پر کیا گزری، کون مرا کون جیا؟ گھر کی کیا حالت ہے؟ بیوی پر کیا بیتی اُس کے سینے میں کونسی حسرتیں سُلگ رہی ہیں؟ یہ سب باتیں اُس کے لئے بے معنی ہیں۔ اُف! وہ آدمی نہیں، پتھر ہے۔ بے حس اور جامد! اُس کا دل فائلوں کے بوجھ تلے دب کر مر چکا ہے۔ اُس کے جذبات ایک ہی نقطے پر جم گئے ہیں۔ جس گھر میں ایسا آدمی ہو، وہ گھر جہنم ہے جہنم!

اُس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔

وہ کیوں اُس کے بارے میں سوچتی ہے؟ لیکن آج کئی دنوں کے بعد اُس کا دماغ سوچ کی گرفت میں آگیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس سی محسوس کرنے لگی۔ وہ اُنہی دنوں بی۔ اے پاس کر چکی تھی۔ اور دہلی سے اپنے باپ کے ساتھ کانپور آئی تھی، ایک تمدنی نمائش دیکھنے کے لئے۔ وہ مسٹر مہیش کے مکان میں ٹھہرے تھے۔ اُس کے باپ کے مہیش سے پرانے تعلقات تھے۔ وہ مرحوم باپ کی دولت اور جائداد حاصل کرنے سے پہلے دہلی ہی میں کام کرتے تھے۔ اُنہیں ایک شاندار مکان ملا تھا جو ساز و سامان سے بھرا پڑا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُنہیں مرحوم باپ کی چھوڑی ہوئی کتنی دولت ملی۔ وہ گھر میں تنہا تھے۔ اُس دن شام کو جب پتاجی نے اوشا کا مسٹر مہیش سے

تعارف کرایا تو وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ جیسے وہ عرصے سے انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اچھے خدوخال کے مالک تھے۔ چہرے پر ایک نامعلوم اُداسی اور سنجیدگی کے آثار تھے۔ اُس دن جب اُس کے پتاجی ہر موضوع پر بولتے رہے تو ہیتش بیچ بیچ میں صرف ہُوں ہاں کرتے رہے۔ اور وہ اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ اور خود بھی کوئی بات نہ کر سکی۔

فوراً بعد اُس کی شادی ہو گئی۔

لیکن شادی کے بعد ہی اُس کے خوابوں کے ستارے ٹوٹ کر بجھ گئے۔ اُس کی زندگی پر حسرتوں کے اندھیرے چھا گئے۔

وہ ہر وقت اُداس رہتی۔

اُداس اور کھوئی کھوئی سی۔

اور جب تک ہیتش دفتر میں رہتے اُسے قدرے سکون ملتا۔ وہ گھر کی چیزوں کو سنبھالتی۔ کبھی کوئی انگریزی ناول پڑھتی۔ اور کبھی مصوری کی کتاب میں گم ہو جاتی۔ لیکن جونہی وہ گھر میں قدم رکھتے وہ مایوس ہو کر اپنے کمرے میں جا بیٹھتی۔

نیتا اور اُداس!

اور پھر نہ جانے وہ کن اُداس خیالوں میں بھٹکتی۔ گھر کی ہر چیز سے اُسے وحشت ہوتی۔ وہ در و دیوار سے نفرت کرتی۔ اور اپنے آپ سے بھی نفرت کرتی۔ تنہائی اور مایوسی کے یہ لمحے اُس کے احساس میں زہر گھول دیتے لیکن ہیتش کو اِس کی کیا پروا؟ وہ اسی طرح فائلوں سے اُلجھے ہوئے ہوتے۔

جب کئی بار اوشا نے کہا۔

"شام کو پارک چلیں گے۔ سبھی جاتے ہیں۔ تازہ ہوا صحت کیلئے ضروری ہے۔"

اور وہ یہ کہہ کر ٹال گئے۔

"تجھے ٹہلنے میں کوئی تک نظر نہیں آتی۔ ادھر دفتر کا کام بھی تو ہے!"

تو اوشا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور وہ اکیلی شام کی سیر کو جانے لگی۔ اور جیلیش نے کبھی کچھ نہ کہا۔ ان کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہ آئی۔ اور جب ایک دن وہ انگریزی فلم دیکھ کر رات کو دیر سے گھر لوٹی تو دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ آج وہ ضرور ناراضگی کا اظہار کریں گے۔ لیکن وہ اس رات بھی ایسے ہی پیش آئے جیسے کچھ نہیں ہوا تھا۔

اور وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"آپ نے کبھی میری بنائی ہوئی تصویریں نہیں دیکھیں؟"

وہ ایک شام کو پیار سے بولی۔

وہ ایک طویل عرصے کے بعد ساتھ چائے پی رہے تھے۔ اوشا کے چہرے پر سرخی کی تحریر ابھر آئی تھی۔ اس کے دبلے دبلے ارمان انگڑائی لے رہے تھے۔

"میں کالج لائف میں بھی تصویریں بناتی تھی۔ میں نے آرٹ کے بہت سے اسکولوں کی اسٹڈی کی ہے۔ جب میں تھرڈ ایئر میں تھی تو میں نے نمائش کے لئے جو تصویر بنائی، اسے فرسٹ پرائز دیا گیا تھا۔ لیکن، لیکن نہ جانے اب مجھے کیا ہو گیا ہے، آپ ——"

"کچھ برا تو نہیں ہوا۔ یہ تصویریں بنانا تو وقت ضائع کرنا ہے!"

جیلیش نے چہرے کو سکیڑ لیا۔ "کیا رکھا ہے آرٹ میں، چند ٹیڑھی میڑھی لکیریں۔ پلیٹو نے کہا ہے کہ آرٹ نیچر کی شکل کو مسخ کرتا ہے۔"

اور وہ بوکھلا کر دیکھتی رہی۔

ایک دن اُس کے ضبط کا پیمانہ چھلک اُٹھا۔ اُس کے سینے میں دبی ہوئی نفرت اور غم و غصّہ کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔

"آپ مجھے بچّے کی طرح ٹالتے ہیں۔ میں بچّہ نہیں، عورت ہوں۔ آپ نہیں آئیں گے تو کیا میں اکیلی نہیں جا سکتی؟" وہ چیخ رہی تھی۔ "میں ضرور جاؤں گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ آپ نے میری زندگی کو گھن لگا دیا ہے۔ آپ انسان نہیں، مٹی کے مادھو ہیں۔ کیا سب عورتوں کے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟ میں جاؤں گی آج ہی جاؤں گی! سن لیجیے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔"

اور جب وہ کان پور سے دہلی پہنچی اور پتاجی کو ساری داستان سنائی تو وہ بھی مہیش پر بہت خفا ہوئے۔ پتاجی انکم ٹیکس کی مصروفیات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ ضرور ساتھ آتے۔ اور ——————

"لیجیے چائے حاضر ہے۔ گرم گرم چائے!"

چوکیدار اُسے دیکھ رہا تھا۔

اور اوشا خیالوں کے دُھندلکوں سے باہر آگئی تھی۔

وہ چائے کے گھونٹ حلق سے اُتارتی رہی۔

"چائے پی چکیں آپ!" اتنے میں دروازے پر مسٹر سنہا آگئے۔ اُن کی بیوی ساتھ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔

"پی رہی ہوں۔ آپ بھی ایک کپ پی لیجیے۔"

"بھئی ہم تو پی چکے۔ آیئے اب پارک میں چلیں!"

"یہ شام اکٹھے گزرے گی۔"

مسٹر سنہا بولے۔

اُنہوں نے اپنی بیوی کے چہرے سے نظریں اُٹھائیں۔ اور ادشا کے جوان جسم کو دیکھنے لگے۔

"کل شام ہم نہ جانے وادی کے کس حصّے میں ہوں گے!"

"یہ شام بہت پیاری ہے، چلئے باہر چلیں۔"

ادشا مسکرائی۔

وہ تینوں باہر چلے گئے۔

جنگلی پھولوں کی خوشبو سے جھکی ہوئی نرم ہواؤں کا ریشمی آنچل سرسرا رہا تھا۔ ہر طرف خوابوں کے سنہرے دھندلکوں کی ایک دُنیا آباد ہو رہی تھی۔ پختہ سڑک سے نیچے حسین اور البیلی وادیاں شام کی رعنائیوں میں ڈوب چکی تھیں۔ سورج کی طلسمی کرنیں صنوبر کی گھنی شاخوں سے گلے مل رہی تھیں۔ شام کے اس جادو میں وہ تینوں کھو سے گئے۔ مسٹر سنہا کبھی کبھی بیوی کی نظریں بچا کر ادشا کی طرف دیکھ لیتے اور ہونٹوں پر زبان پھیر لیتے۔ ادشا کے گھنے ریشمی بال اُس کے گداز شانوں پر جھک رہے تھے۔ اُس کے عارض کو شفق نے گلنار بنا دیا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں اُس حسین شام کا سارا حسن اور رعنائی سمٹ کر آ گئی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی کل اُس کی زندگی کا سب سے پیارا خواب پورا ہو جائے گا وہ بچپن سے یہ خواب دیکھتی رہی ہے۔ اُس نے یہ خواب آنکھوں کی روشنی میں بسایا ہے۔ وہ اُس سے پیار کرتی رہی۔ اُس کی ماں اکثر اُن لمحوں کا ذکر کرتی، جو اُس نے اِس فردوس میں گزارے تھے۔ وہ اور دوں سے اس کی باتیں سنتی۔ تصویریں دیکھتی تو اُس کا دل بے قرار ہو جاتا۔ اور وہ کل اپنے خوابوں کی جنت میں قدم رکھے گی۔ خوش رنگ پھول اُس کے قدم چوم لیں گے۔ وہ ندیوں کے نقرئی سنگیت کو پی جائے گی۔ وہ آبشاروں کے گیتوں کو روح کے آنچل

میں چھپالے گی۔ وہ خاموش جھیلوں میں چمکتے ہوئے کنول کے پھولوں کو چھوئے گی وہ شگوفوں کی رنگین خلوتوں میں جھوم اُٹھے گی، اُس کے جذبات میں پھولوں کی آگ دہک اُٹھی۔

لیکن ———

لیکن وہ تنہا تھی ——— !

وہ تنہا تھی ——— !!

"آئیے بیٹھئے!"

مسٹر سنہا نے نوجوان کشمیری کے لئے بنچ پر جگہ بنالی۔

"کل ہم آپ کے سرینگر میں ہوں گے۔"

"جی ہاں!" نوجوان کشمیری انجینئرنگ کا ٹریننگ کورس ختم کرکے واپس اپنے گھر آرہا تھا۔ آپ وہاں میرے مہمان رہیں گے۔"

"آپ کی وائف سے ملیں گے ہم، کیوں اوشا؟"

اوشا کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ لوگ مہینہ بھر وہاں ٹھہریں گے تو ضرور میری وائف سے بھی ملیں گے!"

"کیا مطلب؟"

مسٹر سنہا متعجب ہوئے۔

"ایک مہینے کے بعد میری شادی ہے۔"

نوجوان کشمیری قدرے جھینپ گیا۔ مسٹر سنہا نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ اور اوشا نے سبھوں کے چہروں کو دیکھا اُنھیں ٹٹولا۔ اور پھر ڈوبتے سورج کے ساتھ خیالوں میں

ڈوب گئی۔

شام کے سائے پُراسرار منظر پیش کرنے لگے۔

وہ چند لمحوں تک بیٹھے رہے۔ نوجوان کشمیری پہلگام اور گلمرگ کی باتیں سناتا رہا ——————

وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پارک کے جنگلے کے ساتھ کھڑی رہی۔ نہ جانے اُسے کیا ہو گیا ہے؟ معمولی باتوں پر سوچتی ہے، اُلجھتی ہے اور اداس ہو جاتی ہے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ جھنجھلائی۔

اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔

وادی کی شاداب بہاریں اُسے پکار رہی تھیں۔ وہ آبشاروں کی مدھر آواز سن رہی تھی۔ یہ آواز اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

لیکن ——————

لیکن وہ اکیلی تھی ——————

اُسے لمحہ بھر کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے بہاریں ماتم کر رہی ہیں آبشار غم کے گیت گا رہے ہیں۔

اُف ——— !!

وہ اچانک پارک سے ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگی۔ مسٹر سہائے بیوی سے نظریں ٹکرائیں اور دونوں مسکرائے۔

وہ کمرے کے اندر آتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ خاموش اور ویران سا کمرہ کرسیوں اور ٹیبل پر گرد۔ چھت پر مکڑی کے جالے۔ یہ ویرانی، وحشت اور اداسی!

وہ گھبرا اُٹھی۔

اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی رُوح میں تنہائی اور ویرانی کے سانپ ناگ بن کر لہرا رہے ہیں۔ کھڑکی سے باہر رات کی بھیانک تاریکیاں اندر کمرے کی طرف لپک رہی تھیں ــــــ!

وہ سوچتی رہی ــــــ

کئی لمحے گزر گئے ــــــ

اچانک بغل والے کمرے میں مسٹر سنہا اور اُن کی بیوی کے ملے جلے شوخ اور رنگین قہقہے بلند ہوئے۔ یہ رنگین قہقہے ــــــ جیسا اُس کی نگاہوں کے سامنے مسٹر سنہا آ گئے۔ وہ اپنی نئی شوخ و شنگ بیوی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے اپنی آتشیں سانسوں کے ساتھ نہ جانے اُس کے کان میں کیا کہہ رہے تھے۔

اور پھر دونوں کے قہقہے۔

وہ کھو سی گئی۔

اُس کے جذبات میں مستی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ قہقہے پھر بلند ہوئے وہ چونک اُٹھی۔ یہ قہقہے اُس کے دماغ پر ہتھوڑے چلانے لگے۔

"بند کر دو یہ بکواس!" وہ چیخنا چاہتی تھی۔ اُس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اُس کے سارے جسم پر پسینہ آ گیا۔

رات اپنی گمبھیرتا اور ویرانی کے ساتھ بھُوت کی بھاڑی پر چھا گئی۔

اوشا سر کو ہتھیلیوں میں لئے ہوئے اُلجھے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

اُس کا جسم سرد ہو چکا تھا۔

صبح چوکیدار اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اُسکی آنکھوں کی خوبصورتی غائب تھی۔ اُسکے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اُسکے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ بیمار سی معلوم ہو رہی تھی۔ "بس آدھ گھنٹے میں سرینگر جائیگا آپ لوگ پہلی بار سرینگر جائیگا۔ صاحب لوگ روز وہاں جاتا ہے۔ عیش کرتا ہے" وہ کہہ رہا تھا۔ لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس نے دہلی واپس جانے کا ارادہ کر لیا ہے ———— !!

آفس کے پارک میں دور تک ننگے دھڑنگے چنار نرم نرم دھند میں اپنی باہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ اِدھر اُدھر زمین پر سوکھے اور زرد پتّے بکھرے تھے۔ آفس کا بوڑھا چوکیدار اور اس کی دو لڑکیاں بڑے انہماک سے ان پتوں کو ڈھیروں میں جمع کر رہی تھیں سورج کئی دنوں سے بادلوں کا دبیز نقاب اوڑھے ہوئے تھا۔

سلام خان، صاحب کے کمرے کے باہر بنچ پر جیسے برف کی بڑی سل کی طرح جم کر رہ گیا تھا۔ وہ برآمدے سے دور، تخ بستہ، دھندلی خاموش فضا میں کھو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ کے انگاروں کی سی چمک تھی۔ اس کی دراز اور گھنی مونچھوں میں ایک غیر مرئی جنبش ہو رہی تھی۔ اس کے بھینچے ہوئے مضبوط جبڑے سختی سے کسے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ زیادہ بارعب اور گمبھیر دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ پچھلے بیے ماضی کے کھنڈروں میں جا گھستا اور تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا۔ لیکن ایسے لمحے اس کی زندگی میں کبھی

کبھار آتے ——— !

یہی موسم تھا ——— سردی کے چبھتے ہوئے جھونکے، دھند میں لپٹی ہوئی فضائیں، کیمپ کے چاروں طرف گرے ہوئے پتوں کے ڈھیر اور وہ کیمپ میں باقی ساتھیوں کے ساتھ وہسکی کی آگ اپنی رگ رگ میں گھول رہا تھا۔ اتنے میں اسے تار ملا کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس وقت جیسے اچانک کئی گولیاں سنسناکر اس کے سینے کے پار ہو گئیں وہ اسی دن شام کو گھر پہنچا ——— تھکا ماندہ، اداس، خاموش زیبہ کی لاش ابھی تک گھر ہی میں تھی۔ کیونکہ اس کی ماں کے پاس کفن کے لئے پیسے نہ تھے۔ زیبہ مر چکی تھی۔ اس کی بادام جیسی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو چکی تھیں ——— بادام کے شگوفوں پر اولے پڑ چکے تھے! زیبہ اس سے بچھڑ چکی تھی ——— ہمیشہ کے لئے! وہ ایک خاموش سیدھی سادی اور پیاری عورت تھی، جب کبھی وہ اسے بُرا بھلا کہتا یا اس کی ساس کسی کام پر ٹوکتی تو اس کے پرسکون چہرے پر ایک ہلکی سی شکن بھی نہ آتی برابر کام پر کام کئے جاتی، وہ اس سے کتنی محبت کرتی! اور اس کی شرمائی ہوئی مسکراہٹ! ——— لیکن آج وہ مر چکی تھی، اس کی سرد لاش سامنے تھی، کاش اس نے حکیم صاحب کے بجائے ڈاکٹر کا علاج کروایا ہوتا، کاش وہ شہر سے، گھر سے دور نہ ہوتا! لیکن ——— ؟

اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرا

اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں!

اور اس نے اپنے ہاتھوں سے زیبہ کو قبر میں اتار دیا۔

اور پھر اس کی آنکھوں کی رنگت بدل گئی، اس کی آنکھیں سرخی مائل زرد ہوتی گئیں، وہ خاموش رہنے لگا۔ اس کے چہرے پر زیادہ سختی اور تناؤ

آگیا اس کی باتوں میں تلخی اور کھردراپن پیدا ہوگیا۔ اس کے مزاج کا چڑچڑاپن بڑھ گیا۔ اس کی ماں اس سے خائف رہتی وہ چوری چھپے پیر دل فقیروں سے تعویذ گنڈے لے آتی۔ محلے والے سوچتے، کہ اب وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ وہ کسی آسیب کا شکار ہے۔ کیونکہ اس نے جنگ میں بے شمار لوگوں کو قتل کیا ہے، کچھ کہتے کہ وہ رات کو مطلق نہیں سوتا، سلام خان ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرتا۔ وہ اب سرخ نگر ہی میں ایک محکمے میں جمعدار کے عہدے پر مامور تھا، زیبہ کی وفات کے بعد ہی اس نے ملٹری سے استعفٰے دے دیا تھا، اور ایک فوجی آفیسر کی سفارش پر وہ محکمہ مال میں ملازم ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ شیو کرتا، اپنی وردی پر استری کرواتا، مونچھوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا، اور پگڑی کا شملا اس کے مضبوط اور بلند قامت جسم پہ خوب جچتا۔

بہت دن سے اس کی ماں اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ دوسری شادی کرلے، وہ بار بار کہتی، میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں، ڈوبتے سورج کا کیا بھروسہ!؟ اور اب کھانسی سے کلیجہ میرے منہ کو آتا ہے، روز ہی بخار رہتا ہے، میری بہو آتی، وہ گھر کو سنبھال لیتی اور میں آرام سے جان دیتی۔

اور وہ ہر بار خاموش رہتا ــــ ایک تھکا دینے والی خاموشی۔

وہ خود بھی کبھی سوچتا کہ، اس کے ہونٹ کیوں نہیں ہلتے!

اس کی ماں تو سچ ہی کہہ رہی ہے!

لیکن وہ دوسری شادی کا خیال کرتے ہی کانپ جاتا ــــ زیبہ اسے کیا کہے گی، وہ اس سے کتنی بار کہہ چکا تھا۔ زیبہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے میں دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا اور یہ سن کر

زیبہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے!

اور جب ماں ایک مہینے کی شدید علالت کے بعد کچھ سنبھلی تو اس نے دوسری شادی کرلی۔ یہ ایک عجیب عورت تھی، موٹی، بھدّی اور بے وقوف! اسے گندگی سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس کے موٹے چہرے پر چیچک نے خوب گلکاری کی تھی، وہ ہر وقت اس کی ماں سے جھگڑتی۔ جو بات ساس کرنے کو کہتی، اسے ٹال دیتی۔ پہر دن تک سوتی رہتی! گھر کا کام کاج بھی وہ بے دلی سے کرتی۔ جتنے مٹی کے برتن، گھڑے، ہنڈیاں، بڑے برتن اس کی ماں نے دن رات پشم کات کات کر جمع کرلئے تھے۔ اس نئی بہو نے ایک ایک کرکے چکنا چور کر دیئے تھے۔ سلام خان ان سب باتوں کو دیکھ رہا تھا وہ بنتی شعلہ بار آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتا۔ لیکن اس کے بے ڈھنگے اور بدصورت چہرے کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ جاتا، اور زور زور سے حقہ گڑگڑانے لگتا۔

ایک دن جب وہ آفس سے آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس کی ماں سے جھگڑ رہی ہے اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ ... "تم کون ہوتی ہو مجھے ٹوکنے والی ڈائن۔ گھر کی مالک میں ہوں، بڑھاپے نے تیری عقل ماردی ہے۔" وہ دروازے پر سنتا رہا۔ اس کی ماں نے بیٹے کی جھلک دیکھ کر زور زور سے رونا شروع کیا، لیکن اس کی بیوی کو ذرا سی بھی شرم نہ آئی، وہ ذرا بھی نہ جھجکی، جیسے اس کی آنکھوں کا پانی مرچکا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔

کیا وہ ایسی عورت کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے؟

دن بھر فاقہ کرنے کے بعد ایک دن جب شام کو اس نے کھانے کے

برتن میں ہاتھ ڈالا، تو اس نے دیکھا چاول پھر کچے تھے۔ اسے غصہ آیا اور اس نے کچے چاولوں کے ساتھ ساگ ملایا، تو یہ اس ساگ میں مرچیں نام کو نہ تھیں صرف نمک!

"ساجی۔ !" اس نے برتن کو چاولوں سمیت دیوار کی طرف پھینک دیا۔ ایک دھماکا ہوا۔

"یہ کھانا ہے یا تمہارا سر" وہ چلایا۔

"آپ کو مزا نہیں آتا۔ تو میں پلاؤ کہاں سے لاؤں، ہر وقت مجھی پر برس پڑتے ہیں۔ کسی دوسری عورت کو گھر کیوں نہیں لاتے۔ میں کل ہی میکے چلی جاؤں گی۔

اور اس نے اسی وقت ساجی کو گھر سے نکال باہر کیا۔ ہمیشہ کے لئے کوئی بھی اس کے فیصلے کو بدل نہیں سکتا تھا۔

کئی سال گذر گئے، ساجی کے گھر والوں نے کتنے آدمیوں کو اس کے پاس بھیجا، لیکن وہ چٹان کی طرح سخت رہا۔

اس کی ماں اب ایک دائمی مرض کی شکار ہو چکی تھی۔ مشکل سے ڈیڑھ دو پاؤ چاول پکاتی۔ اور وہ بھی بیٹے کی محبت کی خاطر۔ کئی بار جب اس کے دمے کی شکایت بڑھ جاتی، اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگتا، تو اسے دن بھر کی تھکاوٹ کے باوجود خود ہی کھانا پکانا پڑتا۔

اس نے ایک عورت سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اس کی بیوی ایک دو بار اس کے گھر آئی تھی۔ لیکن اب کل سے وہ مستقل طور پر آگئی تھی ۔۔۔

یہ خیال آتے ہی اس کے تصور میں کوئی ہلکی سی لہر بھی نہیں اٹھی اس کی دھڑکنوں میں کوئی شوخی نہ آئی۔ اس کے برعکس اس کے چہرے پہ بیزاری

اور تلخی کے سائے پھیل گئے!

"مجھے صاحب سے ملنا ہے" کوئی آدمی صاحب سے ملنے آگیا تھا!
جمعدار کو متوجہ نہ پاکر وہ پھر کہنے لگا۔

"مجھے ضروری کام ہے جمعدار"

"کام وام کچھ نہیں "صاحب اس وقت نہیں مل سکتے"!

وہ اچانک اپنی کھردری آواز میں گرج اٹھا۔ جیسے بم کا گولہ پھٹ گیا ہو اس کی مونچھیں تھرائیں۔ اور وہ بنچ سے اٹھ کر برآمدے میں اِدھر اُدھر چلنے لگا۔ "یہ کون سا وقت ہے صاحب سے ملنے کا۔ عجیب لوگ ہیں ——"
وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔

بوجھل قدموں کے ساتھ جب وہ گھر کی طرف آرہا تھا۔ تو پھر زیبہ کی یاد رہ رہ کر اس کے دل میں جھنجھوڑ رہی تھی —— زیبہ زندہ ہوتی تو وہ کتنا خوش ہوتا —— وہ کیوں مرگئی —— زیبہ سے اس کا محض جسمانی تعلق نہ تھا، وہ اس کی روح کی قرار تھی، اور اگر روح کا قرار چھین لیا جائے تو ——؟

اس کی نئی بیوی بالکل جانور تھی، شادی کے پہلے سات دنوں ہی میں وہ اس سے نفرت کرنے لگا —— شدید نفرت! ظاہری خدوخال سے وہ اچھی ہے۔ تو کیا ہوا؟ وہ ہے دراصل حیوان —— صبح کے ۹ بجے نیند سے اٹھتی۔ اور ہر وقت سر کے درد کا بہانہ کرتی۔ اسے نئے گھر، نئے آدمیوں، نئی زندگی اور نئی ذمہ داریوں کا مطلق احساس نہ تھا، اسے اپنی ساس کا کوئی کھٹکا نہ تھا، وہ چپکے سے گھر سے نکل جاتی، اور ہمسایہ عورتوں سے پہر دن تک باتیں کرتی، گھر کی ہر چھوٹی بڑی بات ان سے کہتی، اُسے ساس کے سامنے بھی شرم نہ آتی ——

کتنی بری عادت ہے ایک بار جب ساس نے اسے محلے کی کئی عورتوں کے سامنے زبان کی قینچی چلانے پر ٹوکا۔ تو وہ فوراً سر کے درد کا بہانہ بنا کر لحاف میں گھس گئی۔ اور روتی رہی۔ کس مصیبت میں اس کی جان پھنس گئی، کتنی منحوس عورت ہے، کاش اس نے یہ تیسری شادی نہ کی ہوتی!۔

وہ جب صحن کے اندر داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ کمرے کے اندر کسی عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

یہ گاشی ہی تو ہے!
شاید آج کوئی نیا گل کھلا ہے۔۔ وہ جھنجلایا۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کی مونچھیں تھرائیں۔ اور آنکھوں کی سرخی الاؤ بن گئی ــــ وہ ایسی ڈائن کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کی نحوست بھرے گھر کو ویران کر دے گی۔ اُسے آج ہی کوئی قدم اُٹھانا چاہیئے نہیں تو ــــــــــــ

وہ اندر داخل ہوا ــــ ایک پاگل کی طرح!
باورچی خانے کے ایک حصے میں، جہاں میلی سی چٹائی بچھی تھی، اس کی ماں کے پرانے بستر کے گرد کئی اور چہرے تھے۔

پہلی نظر میں وہ اُنہیں پہچان نہ سکا۔
وہ دروازے پر کھڑا رہا۔ اور اس نے دیکھا، ماں کے سرہانے ساآجی کا بوڑھا باپ بیٹھا ہے۔ سر کو پیرہن کے گریبان میں ڈالے ہوئے ماں کے قدموں پر ساآجی اپنے موٹے جسم کے ساتھ بیٹھی رو رہی ہے، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ روتے روتے اس کا موٹا سا بھدا چہرا سرخ ہو گیا ہے۔ کمرے کے اس طرف گاشی ہے۔ چپ چاپ، اس کی پلکوں پر تھمے آنسو کانپ رہے ہیں۔

"یہ سب کیا ہے ——؟" وہ چیخ اٹھا۔

سب خاموش تھے۔ خاموشی کی گود میں ساجی کی ہلکی ہلکی سسکیاں ڈوب رہی تھیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو ابھی لڑکی ——" ساجی کا باپ ہمت کر کے بولا۔ "اپنے گناہوں کی معافی کیوں نہیں مانگتی۔ ماں کے قدموں پہ کیوں نہیں گر تی ——؟"

اتنے میں ساجی نے سر سے دوپٹہ اتار کر اپنی ساس کے قدموں پہ ڈال دیا، اور خود چٹائی پہ ماتھا رگڑ کر زور زور سے رونے لگی۔

کمرہ اس کے رونے کی دلدوز آواز سے گونج رہا تھا۔

"بس، بس، میری بیٹی!" اس کی ساس بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "ہمارا دل اب صاف ہو گیا، اٹھو سر کو ڈھانپ لو، جب خدا اور رسول بخشتے ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں بھلا؟ خدا نہیں ہدایت کرے۔ دونوں شیر و شکر بن کر رہو ——"

وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں نور کی ہلکی ہلکی لہریں رینگ رہی تھیں۔ اور وہ اپنے لخت جگر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کے دل کی ہی بات کہہ رہی ہو۔ آخر اس کے بیٹے کی رگوں میں بھی اسی کا خون ہے!

سلام خاں بت کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کے چہرے پہ تاریکی پھیل رہی تھی۔

اس کے ہونٹ ساکن تھے۔

لیکن اس کے نتھنوں میں کئی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

لہریں گا رہی تھیں!

خزاں کی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔

دور دھندلکوں میں چھپے ہوئے پہاڑوں کی اوٹ سے آنسو بھری آنکھیں

ابھر رہی تھیں — ساجی اور کاشی کی آنکھیں!!

اور زینب — ؟

جاؤ ساجی، سلام کے لئے آج تم ہی چائے بناؤ، آٹھو اسے بھوک

لگی ہوگی۔ اور ہاں کاشی تم کیا دیکھتی ہو، جاؤ کانگڑی میں آگ بھر لو — ،

اچانک وہ کمرے میں چلا آیا اُسکے منجمد ہونٹوں پر ایک ارتعاش تھا۔

ہاں! زینب ——— ساجی ——— اور کاشی!!

وہ رات کتنی سرد اور تاریک تھی۔

بارش نے رات بھر رُکنے کا نام نہ لیا۔ کوارٹر کی چھت پر بارش کے قطرے ایک ساز اور بے اسرار شور کو جنم دے رہے تھے۔ اور یہ شور رات کی بے پناہ تاریکی اور سناٹے کو اور بڑھا رہا تھا۔ کبھی کبھی جب کانتا بے چینی سے ڈاکٹر اینش کے پسینے اور زرد ہوتے ہوئے عرق آلود چہرے سے نظریں اُٹھا لیتی اور سبز رنگ کی مدھم روشنی والے لیمپ کی طرف دیکھتی تو اُسے محسوس ہوتا جیسے پہاڑ کی ڈھلوان پر بارش کا طوفان اُمڈ رہا ہے، یہ سارا طوفان سمٹ کر اُس کے دل و دماغ پر چھا رہا ہے۔ یہ طوفان کہاں سے آیا تھا؟ یہ طوفان کہاں جا کر رُکے گا؟ اُس طوفان میں سب کچھ بہہ گیا۔ بارش کا شور اس ویران رات کی وحشت کو بڑھا رہا تھا لیکن کانتا کے دل کو اطمینان مل رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر طمانیت کی روشنی پھیل رہی تھی۔ اُس کے احساس میں ایک انجانی کیفیت کا نشہ طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر اینش بستر پر بے ہوش پڑا تھا وہ قریب آ کر اُس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، اُس کا تنفس تیز تھا اور اُس کا سارا

جسم گرم بھٹی کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس کے کھلے ماتھے کی لکیریں نمایاں
ہوگئیں۔ کانتا اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کے گرم ماتھے پر ہاتھ رکھتی، اُس
کے گالوں کا پسینہ صاف کرتی، اور ایسا کرتے ہوئے وہ نہ جانے کہاں کھو
جاتی، بارش کا شور، دور وادیوں میں ڈوب جاتا۔ اور وہ رات بھر اُسے دیکھتی
رہی۔ اُس کی ڈوبتی ہوئی نبضوں میں اپنے دل کی دھڑکنوں کی صدائے،
بازگشت سنتی رہی۔ معینہ وقفوں کے بعد اُس کے بازو میں پنسلین کا انجکشن دیتی
رہی۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ جیسے پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ وہ
تین برسوں سے بیماروں کا علاج کرتی رہی ہے۔ لیکن آج کیسی دیوانگی کے ساتھ
وہ ڈاکٹر اینش کو اٹینڈ کر رہی تھی۔ کاش! یہ رات اور دراز ہو جائے! اور باہر کا
طوفان کبھی تھمنے نہ پائے۔

اُس نے بیمار کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ایک ایسی نظر جس میں
اُس کی زندگی کی تمام تر لطافتیں موجود تھیں۔ اُس کا تنفس نارمل ہو رہا تھا۔ اور
بخار بھی کم ہو رہا تھا!

ڈاکٹر اینش ایک خوبرو اور باوقار آدمی تھا۔ وہ ایک مہینے اُس پہاڑی
علاقے میں سرکار کی طرف سے تعینات کیا گیا تھا۔ کیونکہ اُس علاقے میں ٹائیفائڈ
ایک وبا کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ سینکڑوں آدمی اس وبا کے شکار ہو چکے
تھے۔ ڈاکٹر کانتا دن رات بیماروں کا علاج کرتی رہی۔ لیکن وبا بڑھتی گئی۔ ڈاکٹر
اینش آیا تو وہ دونوں آج ایک مہینے سے مسلسل شب و روز بیماروں کا علاج
کرتے رہے۔ پوری سرگرمی، تندہی اور جانفشانی کے ساتھ! اور وہ تین
ہفتوں کے اندر اندر وبا کا زور گھٹ گیا۔ لیکن اینش خود اُس کی زد میں آگیا۔
کل شام سے اُسے بہت تیز بخار تھا۔ اور شام کو جب کانتا اُسے انجکشن لگا چکی

تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور رات بھر بے ہوش رہا۔ وہ بھلا اُسے اِس حال میں چھوڑ کر کہاں جاتی۔ اُس نے کمپونڈر کو رخصت کیا اور ڈیرے والوں کو پیغام بھیجا کہ وہ رات کو نہیں آسکتی۔ اُسے پریس کیس اٹینڈ کرنا ہے۔

اور جب رات نے اپنی گھنی گھنیری بھیگی ہوئی زلفیں سمیٹ لیں۔ اور پہاڑوں کے اُس پار صبح کی نرم اور خنک روشنی کا دھارا چھوٹنے لگا۔ تو امیش نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ ــــــ ؟"

اُس کے ہونٹ کانپ اُٹھے۔

"ہاں میں ہوں ڈاکٹر صاحب!" کانتا کے لہجے میں مسرت تھی۔ اُس کے چہرے پر سے رات بھر کی تھکن کی دھند کافور ہو گئی۔ "آپ کی حالت اچھی نہ تھی۔ میں رات ڈیرے پر نہ گئی۔" وہ وضاحت کر رہی تھی اور امیش کی نم آلود آنکھیں کہہ رہی تھیں "مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ زندگی بھر کے لئے میں آپ کا احسان مند ہو چکا ہوں اور اِس بے پایاں محبت کا میں کیسے بدلہ چکا سکتا ہوں؟" کانتا اُن نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اُس کا وجود جیسے پگھل کر رہ گیا۔ اور اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

امیش چند ہی دنوں میں صحت یاب ہو گیا۔ لیکن اُس کی تنہائی کا بیشتر وقت کانتا کے بارے میں سوچتے ہوئے گزر جاتا۔ کانتا کے ایثار اور محبت نے اُسے خرید لیا تھا۔ اور جب بھی وہ اُس چھوٹے سے ہسپتال میں کام سے فارغ ہوتا اور جب کانتا اُس کے کوارٹر میں آتی تو اُسے محسوس ہوتا جیسے اُس کے من مندر کی دیوی آرہی ہے اور اُس کا سر جھک رہا ہے۔ پتلی سی دراز قد لڑکی۔ چہرے پر ہلکے سے چیچک کے مِٹتے سے نشان، سیاہ آنکھوں پر گھنی،

پلکوں کا سایہ۔ رخساروں پر نامعلوم اداسی)۔ متانت۔ سادگی۔ خط و خال سے ایثار کی پھوٹتی ہوئی شعاعیں!!

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ڈاکٹر!"

ایک دن وہ بولی۔

اس کے لہجے میں ایک اداس نغمے کا گداز تھا۔ اس کے چہرے کی اداسی اور متانت گہری ہو گئی۔

"میرے پتاجی ایک بڑے ٹھیکیدار تھے۔ ہم دو بچے تھے ان کے۔ میں اور میرا ایک چھوٹا بھائی بھوشن۔ مجھے انہوں نے تعلیم دلائی اور ایف۔ ایس۔ سی کے بعد میں نے ایم، بی بی، ایس کیا۔ پتاجی نے ہزاروں روپے خرچ کئے۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی ان کی آرزو تھی۔ لیکن بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میرا فائنل ایئر تھا اور وہ سورگباش ہو گئے۔"

اس کی گھنی پلکوں کے سایوں میں سفید موتی لرزنے لگے۔

"میرا اب کون ہے اس دنیا میں؟ میری زندگی ویران ہے۔ میں۔۔۔ میرا SETTLE ہونا چاہتی تھی۔ ہر عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ اپنا چھوٹا سا گھر"

وہ شرمائی۔ شرمانے کا یہ انداز کتنا پیارا تھا۔ کتنا سحر آفریں تھا۔ کتنا مدہوش کن تھا۔

امیش شام کی حسین تنہائیوں میں اس کہانی کے پیچ و خم سے الجھ رہا تھا۔ وہ اس کے انجام سے واقف تھا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھی کہ اس کہانی کا انجام الف لیلوی کہانی کی طرح اسے زمین سے اٹھا کر، دلہن کے آنچل کی پار فردوس کے کیف زاروں میں گم کر دے گا۔ جب اس کی بھاری پلکیں وا ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ اس نے کانتا کی گھنی پلکوں کے ستارے روح کے دامن میں اتار لئے ہیں۔ کانتا کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اب بھی اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

تھامے ہوئے تھا۔

اور جب تین مہینے گزر گئے۔ اور ڈاکٹر اینش کو واپس بڑے ہسپتال میں جوائن کرنے کا وقت آیا تو جیسے وہ ایک حسین خواب سے جاگ پڑا۔ کاننا اُس کے دل و دماغ پر بہار دل کا ایک نغمہ بن کر چھاگئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی کے پُر پیچ راستوں پر قدم بڑھائیں گے۔ وہ ہر قدم پر نئی جنتیں آباد کریں گے۔ اور اُس نے کہا تھا کہ وہ گھر جاکر شادی کے سب انتظامات مکمل کرلے گا لیکن جب وہ اُس پہاڑی علاقے کے پُر پیچ راستوں سے گزر کر گھر کی جانب جا رہا تھا تو اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی جاگ اُٹھا ہو اور خوابوں کی دھجی دھند چھٹ گئی ہو اور اُس کی نگاہوں کے سامنے اُس کی حسین اور شوخ رُوپا کھڑی ہے۔ ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں میں پیار کے دیئے جلائے ہوئے۔

رُوپا ــــــ !

”ارے تم! ــــ تم کہاں چھپ گئی تھیں؟ میری زندگی مجھ سے رُوٹھ گئی تھی۔ میں کہاں تھا؟ مجھے اپنے ریشمی آنچل کے مہکتے ہوئے سائے میں دم لینے دو۔ تم مسکرا رہی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں شرارت کی چمک ہے۔ دیکھو مجھے نہ ستاؤ۔ اتنے دنوں تک تم نے میری خبر نہ لی۔ میں مرتے مرتے بچا۔ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا۔ ارے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ رُوپا! میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں، تمہیں دلہن بناکر گھر لاؤں گا۔

اور جب وہ گھر آیا۔ اور دوسرے دن ہسپتال میں JOINING REPORT دے کر گھر آیا تو رُوپا آگئی تھی۔ گلابی ساڑی اُس کے شانوں پر لہرا رہی تھی۔ اُس کے خمدار بالوں میں شبنمی راتوں کا حُسن تھا۔ اور اُس

کی آنکھوں میں شوخ تبسّم کی لہریں تھیں۔ اُس کے چہرے پر دوشیزگی کی تازگی تھی۔ وہ اُسے دیکھتا ہی رہا۔ یہ اُسکی اپنی رُویا تھی۔ بھابی یہ کہتی ہوئی اندر کمرے میں گئیں۔

"رُویا آپ سے ناراض تھی۔ میں اسے لائی ہوں۔ اب آپ خود ہی نبٹ لیجئے اس سے!"

"میں کیوں ناراض ہونے لگی ان سے؟"

"رُویا! کیا تم سچ مچ ناراض ہو؟"

وہ اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

"نہیں، تو کیا پھر جھوٹ موٹ ناراض ہوں؟" وہ پھٹ پڑی۔ "آپ وہاں گئے تو واپس ہی کیا آنا تھا؟"

"رُویا ـــــــ!!"

"نہ جانے وہاں کون شریمتی جی تھی جس نے آپ پر جادو کر لیا۔ ایک آدھ خط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملی؟ ایسی بھی کیا بات۔ ہم نے بھی آپ سے نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ اگر باجی اصرار نہ کرتیں۔"

رُویا کا ایک ایک لفظ ہم کے گولے کی طرح چھوٹ رہا تھا۔ نہ جانے وہاں کون شریمتی جی ـــــــ کانتا ـــــ رُویا، رُویا! یہ تم نے کیا کہا۔ اُف!! خواب، خواب کی باتیں۔ خواب نہیں، یہ حقیقت ہے ـــــــ کانتا اُس کی رُوح کے کسی گوشے میں ہمیشہ کے لئے ایک اُداس لے کی طرح آباد ہے! لیکن . . . .

"لیجئے، پی لیجئے چائے!"

بھابی اندر آگئیں۔ اُن کے چہرے پر مسرّت کی لہریں تھیں۔

"سُن لیں، رُوپا کی شکایتیں؟ بھری پڑی تھی وہ بے چاری!"

"بھئی غلطی میری ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ کیوں رُوپا معاف کر دو گی یا سزا دینا چاہتی ہو!"

"ہم نے معاف کیا۔ لیکن ایک شرط پر!"

وہ ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

"کونسی شرط؟"

"آئندہ یوں گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ہو گی!" وہ ہنس پڑی۔

"کیا مذاق کر رہی ہو رُوپا۔ سروس کا معاملہ ہے!" بھابی نہ جانے کیوں سنجیدہ ہو گئیں۔

"مجھے منظور ہے۔"

ابنش نے چائے کی پیالی لی اور مسکرایا۔ اور پھر وہ دیر تک رُوپا کی باتیں سنتا رہا۔ اور ہنستا رہا۔ جیسے اُس نے اپنے ذہن کے تمام دریچے بند کر لئے تھے۔ لیکن احساس کے خلاؤں میں دُور یہ کس کی آواز تھی ——

میں گنا ہگار ہوں۔ میں نے کانتا سے پہلے ہی کیوں نہ کہا تھا کہ میں رُوپا سے ..... لیکن، میں اس سے کیا کہتا؟ اتنی فرصت مجھے کب ملی، مجھے سوچنے کا وقت کہاں ملا؟ وہ ایک بجلی کی طرح چمکی اور میرے دل و دماغ اور میری رُوح کا اُجالا بن گئی۔ کیا اُجالوں کو کوئی ٹھکرا سکتا ہے۔ میں نے اُجالوں سے پیار کیا ہے۔ یہی میرا قصور ہے۔ لیکن رُوپا ——؟

اُس نے کئی بار سونے کی کوشش کی لیکن نیند غائب ہو چکی تھی۔ آج صبح کو بھابی اُن کے پاس آ گئی تھیں۔ جب کہ بھائی صاحب بھی بیٹھے تھے۔ اور وہ کہہ چکی تھیں کہ اگلے مہینے شادی ہونی طے پائی ہے۔ پنڈت جی سے

بات ہو چکی ہے رُوپا نے بی۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ مزید تعلیم وہ یہاں
آکر جاری رکھے گی۔ ہم نے بھی سب انتظامات کر رکھے ہیں۔ اور بھائی
صاحب نے ہر بات کی تائید میں سر ہلایا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کیوں؟
اُسے کیا ہو گیا تھا؟ شادی کی بات سُن کر اُس کے دل کی دھڑکن کیوں رُک گئی؟
وہ خاموش کیوں ہو گیا؟ اُسے بھابی کے قدم چھونے تھے۔ کتنی نیک اور
ہمدرد ہے وہ۔ وہ پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں
اور اسی کی کوششوں سے اُن کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوا چاہتے تھے۔ رُوپا
اُس کی زندگی ہے۔ اُس کی شوخ مسکراہٹوں میں اُس کی آرزو کے دیپ
جلتے ہیں۔ وہ رُوپا میں صرف اپنی محبوبہ ہی کو نہیں پایا تھا۔ بلکہ اپنی رفیقۂ
حیات کو بھی۔ رُوپا کا خیال آتے ہی زندگی کی نا معلوم رہگزاروں پر شمعوں کی
قطاریں روشن ہو گئیں۔ اور آج وہ برسوں سے اُس دن کے انتظار میں تھا۔
جب وہ رُوپا کو اپنے گھر میں دُلہن بنا کر لائے۔ اور ــــ اور وہ اپنی زندگی
کے نئے خوابوں کو سجائے۔ خوبصورت سنہرے جذبے دل میں لئے۔ ہم کھوئے کھوئے
سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ــ !

اور آج ـــــ ؟

رُوپا سے اُس کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ مسرت کی لہر دل پر ڈول
رہا ہے۔ دور دور تک گلاب کے پھول کھل رہے ہیں۔ آبشاروں سے
مدھر نغمے بکھر رہے ہیں۔ اے دنیا کی محبوبہ اب تمہارے کھلنے کی رُت
آئی۔ اے ... دولت سے ذرے ذرے میں نور بھر دو۔ زندگی کو قدر
و نغمے کے ساز پر رقص کرنے کا وقت آیا ـــــ !!

وہ جسم اور دماغ میں تھکن اور اضمحلال لئے ہوئے گھر آ رہا ہے۔

دن بھر کام کرنے کے بعد۔ اور وہاں رُدپا اُس کا انتظار کر رہی ہے۔ پلکوں پہ پیار کے دیئے جلائے۔ آنکھوں میں شوخ مسکراہٹ لئے۔ اور ——
اور وہ گھر کی جنت میں قدم رکھتے ہی تازہ دم ہو رہا ہے!

وہ بے چینی میں بستر سے اُٹھ چکا تھا۔ اور دریچے سے پردہ سرکا کر باہر کھلی فضا کو دیکھ رہا تھا۔ جو دُودھیا چاندنی میں نہا رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ کھو سا گیا۔ لیکن ——؟

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا دریچے سے ٹکرایا۔ چاند بھیں بادلوں کے پیچھے آگیا۔

ایسی ہی رات تھی۔

وہ کانتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں۔ لئے ہوئے تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں چاندنی کی پگھلتی ہوئی لہریں دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی کے نیچے دُور دُور تک وادیوں کے نشیب و فراز نقرئی دھند میں انگڑائیاں لے رہے تھے۔

"کانتا!"

"جی!"

"تم میری زندگی میں چاندنی بن کر آئی ہو!"

وہ مسکرائی۔

اُس کی مسکراہٹ میں شرمائی ہوئی چاندنی تھی۔ اُس چاندنی میں محبوبہ کا پیار، ماں کی ممتا، بہن کی شفقت اور بیوی کی محبت رچی ہوئی تھی ——

یہ عورت کتنی پیاری ہے ——!!

"آپ ڈاکٹر سے زیادہ شاعر ہیں!"

وہ مسکرایا۔

"یہ چاندنی آپ ہی کی دی ہوئی ہے۔ چاند اپنی روشنی سورج سے لیتا ہے۔" اُس کی گھنی پلکیں بھیگ گئیں۔

"کانتا! ——— کانتا تم رو رہی ہو، ارے ——— کہاں گئیں تم؟ چاندنی کہاں چھپ گئی؟ اُس کے سامنے یہ کس کا چلتا ہوا جسم تھا؟ یہ کس کی کنواری سانسوں کی خوشبو اس کے جسم میں بس رہی تھی؟ کانتا! تم قریب آ جاؤ۔ تمہارے شبنمی گیسوؤں کی خنک چھاؤں میں میٹھی نیندیں پلتی ہیں۔ مجھے سکون دے دو۔ میں تمہارے بغیر یہ رات کیسے گزاروں؟ یہ پہاڑ سی رات؟ کوئی ہے؟ کوئی آواز تو دے دو ———!"

وہ کئی دنوں سے گھر ہی پر تھا۔ اور بالکل الگ تھلگ۔ اُس کی ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال اُلجھے ہوئے تھے، ماتھے پر سلوٹیں۔ اور آنکھوں میں سوجن۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ ماتھے کو دونوں ہاتھوں میں لئے۔ اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک پاگل کی طرح۔ اور میز کے قریب آیا۔ اور پھر وہی خط ہاتھ میں اُٹھایا۔

"...... میرے پاس اب رہا کیا ہے؟ اپنا سب کچھ تو آپ کے قدموں پر نثار کر چکی ہوں۔ اب اُس دن کی منتظر ہوں جب آپ کے چرنوں میں مجھے سکون ملے گا۔ اور دن رات آپ کی سیوا میں مگن رہوں گی۔ یہی میرے جیون، میری آتما کی چاہت ہے ساتھی! شادی کا سمے اب نزدیک آ رہا ہے۔ میرے ماموں جان آئے ہوئے ہیں۔ بھوشن بہت تنگ کرتا ہے۔ آپ کا نام اُس کی زبان سے آتا ہی نہیں ......"

اچانک اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اُس کی پیلی پیلی آنکھوں کی وحشت تیز ہو گئی۔ اُس کے جسم میں غیر معمولی کپکپاہٹ پیدا ہوئی۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ذہن کے پوشیدہ گوشے سے کوئی چلّایا۔

اچانک اُس نے خط کو پھاڑ دیا۔ اور فوراً اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور پھر اُن ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اور دوسرے لمحے انہیں ٹیبل پر زور سے پھینک دیا۔ ٹکڑے بکھر گئے۔

"مبارک ہو! لگن کی تاریخ نکل آئی ہے۔ شبھ تاریخ ہے۔ اگلے مہینے کی دوسری تاریخ کو برات جائے گی۔" بھابی چہکتی ہوئی دروازے سے اندر آئیں۔ وہ پھولی نہیں سما رہی تھیں۔

آشیش بت کی طرح ساکت رہ گیا۔ وہ ٹیبل پر بکھرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُسے نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں زبردست ہیجان تھا، ایک طوفان، اور اُس طوفان میں اُس کا وجود، گرد و پیش کی ہر چیز ساری کائنات بہہ رہی تھی۔

"آپ نے سنا نہیں؟" بھابی نزدیک آ گئیں۔ "پنڈت جی ابھی ابھی خوش خبری لائے تھے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ یہ شادی تو بہت دھوم دھام سے کرنی ہے۔ یہ شادی میرے ہاتھوں ہو گی۔ اس شادی میں —"

"شادی، شادی، شادی ———— بند کرو یہ بکواس!!"

اچانک وہ ایک بم کے گولے کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔

"مجھے یہ شادی منظور نہیں ————۔ سنا تم نے! کان کھول کر سن لو مجھے شادی نہیں کرنی ہے ————!!"

وہ ایک پاگل کی طرح چیخ رہا تھا۔

سارا کمرہ جیسے دھوئیں سے بھر گیا۔

اس کے ہونٹوں پر جھاگ آ گئے۔ اس کی آنکھیں انگارہ بن گئیں،

اُس کے چہرے پہ رات کی تاریکی چھا گئی۔
اور بھابی کے گلے میں ایک چیخ اٹک گئی تھی۔
وہ سکتے میں آگئی تھی۔
اور ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کاغذ کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے!!
منتشر اور بے ترتیب ٹکڑے!——————

——— ✦ ———

آج بیساکھی کا میلہ تھا۔ کملا سویرے ہی اٹھ کر نہا دھو کر پاٹھ کر چکی تھی۔
اس کی دیدی، چھوٹی بہن رُوپا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ ہاری پربت چلی گئی تھیں
کملا اب اپنے بسنتی سفید ریشم کا ایک لمبا فراک اور شلوار پہن رہی تھی۔ اور
اس کے احساسات میں رنگینیاں تحلیل ہو رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے
کونوں کو لطیف مسکراہٹ چھو رہی تھی۔ کپڑے پہن کر وہ آئینہ کے سامنے
آئی۔ اپنی نکھری ہوئی صورت کے حسین خدوخال دیکھ کر شرمائی ——
اس کے ابھرے ابھرے سرخ و سفید رخسار، آنکھوں کی دلنشیں گہرائیاں
ہونٹوں کی سرمستیاں، کانوں سے جھلملاتے ہوئے آویزے اور لہراتے ہوئے
گھنے بال —— اس کی آنکھوں میں پرکیف مسکراہٹ ناچ اٹھی۔
پھر اس نے شانِ محبوبی کے ساتھ جسم کو بل دے کر چھاتی پر بکھرے ہوئے
بالوں کو سمیٹ کر شانے پر دھکیل دیا۔ اور نیچی نگاہوں سے اپنی ابھری
ہوئی چھاتیوں کی طرف دیکھ کر پھر مسکرائی —— ایک شرم و حیا میں
ڈوبی ہوئی مسکراہٹ! وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے

ہونٹوں پر رسیلے گیت ڈول رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں حسین اور رحجان
سپنے ناچ رہے تھے!!

کھڑکی کے سامنے رُک کر اُس نے باہر کی طرف دیکھا، سامنے صندوق
نما مکانوں کا ایک دراز سلسلہ تھا ــــ چھوٹے بڑے میلے کچیلے ٹوٹے
چھوٹے مکان ــــ ایک کے پیچھے دُوسرا مکان، جیسے ایک ہی زنجیر کی
ختم نہ ہونے والی کڑیاں ہوں۔ بائیں جانب کملا کے گھر کے مقابل ایک
دو منزلہ مکان تھا۔ جس کے مٹی سے بنے ہوئے چھت پہ ہریالی اُگ آئی
تھی۔ اس میں اندھی ٹیکہ تمنی اور اس کا جوان بیٹا نریندر رہتا تھا۔ دائیں
جانب ایک مکان تھا۔ جس میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے اور ہمیشہ
اپنی بیوی سے جھگڑتے رہتے تھے۔

کملا نے چاروں طرف ایک بھرپور نظر ڈالی۔ آج جیسے سب مکان خلافِ
معمول نامعلوم مسرت میں مسکرا رہے تھے۔ نزدیک کے گھروں سے
بچوں کی مسرت میں ڈوبی ہوئی آوازیں سُنائی دے رہی تھی۔ اور کملا
نے دیکھا۔ نریندر اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مسکرا
رہا تھا۔ آج وہ ایک قیمتی لباس میں ملبوس تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا
تھا۔ اور بائیں ہاتھ سے گھنی مونچھوں کو سہلا رہا تھا۔

وہ چونک پڑی اور اُس نے نفرت اور غصہ سے جھلکتی ہوئی نظر
نریندر پہ ڈالی۔ اور تملاہٹ میں کھڑکی سے ہٹ گئی۔

"کتنا عجیب ہے وہ! ہر وقت میری تاک میں لگا رہتا ہے۔ شرم
نہیں آتی اس کو! اُس دن ــــ اُس دن جب میں دریا میں پوجا
کے پھول ڈالنے جا رہی تھی، تو ــــ تو اُس نے میری کلائی پکڑ لی تھی ــــ

۔۔۔۔اور ۔۔۔۔ اور میں نے اس کی انگلی کو دانتوں سے کاٹ لیا، اور
وہ فوراً بھاگ گیا ۔۔۔۔ پھر وہ کبھی میرے سامنے نہ آیا۔ بزدل ۔۔۔۔
بے غیرت ۔۔۔۔!"

وہ مسکرائی۔

"کون کہتا ہے۔ کہ وہ ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا اور اسے پنجاب میں کسی
سیٹھ کے ہاتھ بیچ دیا، یہ لوگ بھی کیسی باتیں پھیلاتے ہیں، جن کا نہ سر ہوتا
ہے اور نہ پیر ۔۔۔۔ ہُنہ!"

اس کے ہونٹوں پر ایک شدید نفرت اور طنز کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کملا ۔۔۔۔ اری او کملا! ۔۔۔۔!"

یہ ماں کی آواز تھی۔

"جی ۔۔۔۔ آئی ۔۔۔۔"

وہ دوڑتی ہوئی نیچے کمرے میں آ گئی۔ اس کا باپ برج ناتھ اور اس
کی دو بہنیں پربت سے واپس آ گئی تھیں۔ اور سب گرم گرم چائے پی رہے
تھے۔ ماں سماوار کو پھونکوں سے گرما رہی تھی۔

"ہم کس وقت نشاط باغ جائیں گے ماں؟"

وہ پوچھ بیٹھی ۔۔۔۔ نہ جانے کیوں؟ شاید اس کے خیالوں کی ہلچل اب
بھی ختم نہیں رہی تھی۔

"بس ابھی جائیں گے، لیکن ۔۔۔۔" چھوٹی رانی بیچ میں بول اٹھی۔

"لیکن کیا ۔۔۔۔؟ ۔۔۔۔"

"لیکن تمہیں ساتھ نہیں لیں گے ۔۔۔۔" وہ مسکرا پڑی۔

"میں اکیلی نہیں جا سکتی کیا؟"

"نہیں تم اکیلی نہیں جاسکتی ہو —"

"کیوں؟ —"

"تیرا دولہا میاں کہاں ہے؟ —"

وہ ہنس پڑی۔ روپا بھی مسکرائی۔ اور ماں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

برج ناتھ چائے پی کر ایک موٹا رجسٹر دیکھنے میں مشغول تھا۔ لیکن رانی کی بات سُن کر جیسے وہ ٹھٹک گیا۔ اور جلدی جلدی سے رجسٹر کے ورق اُلٹنے لگا۔

اور جب وہ نشاط باغ میں رنگین شگوفوں کی لرزتی ہوئی رنگین چھاؤں تلے چائے کے گرم گرم گھونٹ پی رہے تھے اور رانی برابر بیباکی سے باتیں کئے جارہی تھی، مرد، عورتوں اور بچوں کی ریل پیل بڑھتی جارہی تھی، بہاروں کی آغوش میں ایک نئی زندگی، ایک نیا جوش، ایک نیا حُسن جاگ رہا تھا — مسکراہٹیں، مسرتیں اور خوشبوئیں کروٹیں بدل رہی تھیں، تو کملا کے ذہن کی حلاؤں میں کوئی پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔

"تو اکیلی نہیں جاسکتی — تیرا دولہا میاں کہاں ہے!"

اور وہ دیکھتی رہی۔

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے حسین جوڑیاں اِدھر سے اُدھر جارہی تھیں۔!

مرد اور عورت ——— عورت اور مرد!

دونوں ملتے ہیں اور زندگی کی تکمیل ہوجاتی ہے —!

زندگی کے ہر لمحے میں خوشبوئیں، مسکراہٹیں اور خوشیاں سمٹ کر آتی ہیں۔

اور اس نے دیکھا، عورتیں اپنے شوہروں کے مقابل میں بیٹھ کر فخر

کے جذبات سے جھوم رہی ہیں ــــ مسکرا رہی ہیں، باتیں کر رہی ہیں۔
لیکن ــــ لیکن وہ ــــ ؟!!

یہ خیال آتے ہی وہ بے چین ہو اٹھی۔ اس نے باپ کی طرف نظریں اٹھائیں ــــ جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں پر مرمت کی ہوئی عینک، نہ جانے وہ کن خیالوں میں گم تھا۔ سامنے اس کی ماں تھی، جس کے چہرے پر پچھلی بیماری نے ہلکے ورم کی نشانی یادگار چھوڑی تھی۔
اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا ــــ جیسے نشاط کے شگوفے، پھول اور فوارے اس پر ہنس رہے تھے۔ جیسے سب لوگ مل کر اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔

اس رات اسے دیر تک نیند نہ آئی ــــ وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی ــــ اور اسے یاد آرہا تھا۔ نشاط باغ میں قدم قدم پر شاداب بہاروں میں عورتیں اپنے شوہروں اور ہنستے کھیلتے بچوں کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔
اس نے شوبھا کو بھی اپنے پروفیسر شمبھو ناتھ کے ساتھ دیکھا تھا ــــ کتنی خوش قسمت ہے شوبھا۔ اس کو ایسا شوہر مل گیا جو کالج میں پروفیسر ہے نوجوان اور حسین! یہ شوبھا کی خوش قسمتی ہی ہے۔ ورنہ اسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ وہ کہاں میرے رنگ و روپ کا مقابلہ کر سکتی ہے، سلیمہ اور لیلا کو بھی مجھے دیکھ کر رشک آتا ہے، اور تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہوں ــــ میں بھی اگر کسی ایسے ہی پروفیسر سے بیاہی جاتی، تو ــــ ؟
لیکن شوبھا کے باپ تحصیلدار نے پانچ ہزار روپے کا جہیز دیا اور میرا باپ ــــ ؟ وہ محکمۂ تعلیم میں ایک کلرک ہے۔ اس کی ماہوار آمدنی ساٹھ روپے ہے اور پانچ انسانوں کا بوجھ اس کی گردن پر ہے۔ کہاں سے وہ ہزاروں کا جہیز لا سکتا ہے؟

"تو کیا اس کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

کیا اس کے خوابوں کے شگوفے منتشر ہو جائیں گے؟

کیا اس کی امنگیں گھٹ گھٹ کے مرجائیں گی!

کیا اس کی جوانی یونہی گزر جائے گی؟

شوبھا، لیلا اور سلیمہ تینوں کی شادی ہو گئی۔ حالانکہ تینوں اس سے عمر میں چھوٹی ہیں، لیلا اور سلیمہ کے ہاں دو دو بچے بھی ہیں ——— !

اور وہ ابھی تک غریب ماں باپ کے لئے وبالِ جان بنی بیٹھی ہے۔

اور ماں کے الفاظ اس کے زخموں کو کریدنے لگے ——— "نہ جانے تیری قسمت کو کیا ہو گیا ہے۔ تیرے غم میں سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہوں۔ وہ بھی اسی غم سے کھانا پینا تک بھول گئے ہیں۔ کوئی تجھے پوچھتا بھی نہیں۔ اور تجھے دیکھ کر شرم سے میری گردن جھک جاتی ہے ———"

ماں نے بگڑ کر یہ الفاظ کہے تھے۔ حالانکہ بعد میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اور وہ اس دن کچھ کھائے پئے بغیر صرف روتی رہی ——— !

——— اور محلے کی عورتیں بھی اس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں، اس کی طرف انگلیاں اٹھاتی ہیں اور اسے دیکھ کر سرگوشیاں کرتی ہیں ———

بازار سے گزرتے ہوئے بھی لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے ہیں اور وہ ان کی عجیب نظروں سے کتنی ڈرتی ہے ——— عجیب عجیب نظریں جن میں خوفناک چمک سی ہوتی ہے، اس کا جسم پسینے پسینے ہو جاتا ہے ———

نہ جانے ان سبھوں کو کیا ہو گیا ہے!۔

کملا نے پھر کروٹ بدلی — بیچینی کی حالت میں اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس کے سینے سے پرانی سی لحاف ہٹ گئی۔ لحاف سنبھالتے ہوئے اس کا ہاتھ اس کی ابھری گداز چھاتیوں سے مس ہوا۔ اس کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس کے جذبات میں ایک نامعلوم کیف و سرور کی لہر دوڑ کر رہ گئی۔ اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ میٹھے خوابوں میں ریشمیں سرسراہٹ نے اس کے احساسات میں گدگدی پیدا کر دی —— اب وہ کافی بڑی ہو گئی تھی! — کیا وہ واقعی جوان ہو گئی تھی —— ! یہ جوانی نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جوانی کے میلے پہ اس کی عمر بائیس سال کی ہو گی — بائیس سال!! اور ابھی اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ کب ہو گی اس کی شادی —؟ پچھلے پانچ چھ برسوں سے کتنے گھروں سے بات پکی ہوتے ہوتے رہ گئی — کیوں؟ اس لئے کہ اس کے باپ کے پاس ہزاروں روپے کے زیورات نہ تھے — !

لیکن میری شادی ہو جائے گی۔ وہ سوچنے لگی۔ پنڈت جی کل آ رہے ہیں —— میری شادی کی بات پکی کرنے کی خوشخبری لے کر۔ شادی —!!

جب وہ دن آئے گا، جب میں دلہن بنائی جاؤں گی، میرے جسم کو خوشبو میں نہلایا جائے گا۔ بناؤ سنگھار ہو گا۔ میں سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھوں گی —— شرم و حجاب سے سر جھکائے ہوئے — پیا ملن کے گیت گائے جائیں گے — اور جب وہ راجا میاں آئے گا ——!!

اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اور میں ڈولی بٹھائی جاؤں گی محلے کی مسلمان عورتیں گیت گائیں گی سہ

داروچہ کو نثرہ کردہ حوالے رؤ تیری دادی دکھ سوالے!

اس کی پلکیں جھک گئیں ـــــ !

اور پھر میں ایک نئے گھر میں قدم رکھوں گی، اور پھر وہ وقت بھی آئے گا ـــ وہ وقت، جب دو ابا میاں اور میں ـــ !!!

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی، اس کی آنکھیں سرمستی میں ڈوب گئیں، کھڑکی سے باہر اس نے دیکھا۔

نریندر کے مکان کی چھت پر چاندنی ہریالی سے ہم آغوش ہوکر سو رہی تھی اور نریندر کھڑکی کے پاس ہلکے ہلکے انداز میں ایک فلمی گیت گا رہا تھا۔ کملا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اس کے جسم سے نفرت اور غصہ کے شرارے پھوٹ نکلے ـــ اور وہ بستر پر آگری۔

ــــ ــــ ــــ

دوسرے دن جب سورج سبز پہاڑوں کی اوٹ سے نمودار ہو رہا تھا۔ تو پنڈت جی لمبا چوڑا پیرہن پہنے ہوئے اپنی موٹی توند کے ساتھ بیٹھے ہوئے برج ناتھ اور ان کی بیوی سے باتیں کر رہے تھے۔ اور کملا دروازے کے باہر سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا ـــ !

"بس ـــ چار ہزار مانگتے ہیں وہ ـــ"

"چار ہزار ـــ !!؟"

"اور کیا منشی جی ـــ" پنڈت جی اپنے کاروباری انداز سے بولتے رہے ـــ "لڑکے ملتے نہیں۔ صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں، کلجگ ہے منشی جی کلجگ ـــ"

"لیکن پنڈت جی آپ جانتے ہیں، کہ کملا بڑی ہو گئی ہے ـــ"

برج ناتھ کے لہجہ میں تلخی تھی۔ درد تھا اور منت تھی ـــ "

وہ کافی بڑی ہو گئی ہے، کچھ کیجیے نا، کہیں کوئی لڑکا دیکھ لیجیے، آپ کی سیوا۔"

"میری سیوا کی فکر کرتے ہو منشی جی ——— لڑکے کی بات کرو، لڑکا کہاں سے کو ملے گا ——— ہاں لڑکا خریدنا ہوگا ——— جانے ہی بدل گیا ہے ——— کس سمے میں آ گئے ہم لوگ، آجکل لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے۔ دھن والے لڑکوں کو خرید لیتے ہیں۔ بس دھن چاہیے دھن ——— اب دھن کی پوجا ہوتی ہے منشی جی ———"

اور وہ اتنا ہی سن سکی، اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا ——— اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا ——— کمرے میں آ کر وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی اور سوچتی رہی ——— سوچتی ہی رہی ———!

شام کو باپ آ گیا ——— تھکا ماندہ، اداس، پریشان،

"میں دفتر سے آ رہا تھا ——— " وہ بیوی سے کہہ رہا تھا ——— "کہ شوبھا کے باپ ٹھیکیدار صاحب ملے۔ اور باتوں باتوں میں انہوں نے کہہ دیا، جوان لڑکیوں کو گھر میں بٹھا رکھا ہے، شرم نہیں آتی۔ ان کی کہیں شادی کیوں نہیں کرتے۔ لوگوں میں عجیب عجیب باتیں پھیلی ہیں ———"

وہ رک گیا اور توقف کے بعد بولا۔

"میں یہ سن کر پانی پانی ہو گیا۔ اور میں انہیں کچھ نہ کہہ سکا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کیا جائے۔ یہ لوگ بھی کیسے ظالم ہوتے ہیں ——— اب تو یہی جی میں آتا ہے کہ یا خود زہر کھا لوں۔ یا کملا کو زہر دے دوں ———!!"

وہ اتنا ہی سن سکی۔ اور جلدی سے اوپر کمرے میں آ گئی۔

"جی میں آتا ہے کہ خود زہر کھا لوں یا کملا کو زہر دے دوں ———"

دیر تک یہ الفاظ اس کے ذہن پہ بجلیاں گراتے رہے اس کی آنکھوں سے

آنسوؤں کے ٹپکتے ہوئے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے ——

اور وہ سوچتی رہی —— !!

اور جب وہ کھڑکی کے سامنے آئی۔ تو اس کی آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس کی پلکیں سلگ رہی تھیں۔ اور ماتھے پر پسینے کے کئی قطرے چمک رہے تھے۔

نریندر مکان کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا تھا۔ کملا کو دیکھ کر وہ اُس کی طرف معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگا۔

اور کملا اُس کی طرف دیکھ رہی تھی —— ویران اور کریدتی ہوئی نظروں سے —— !

اور نریندر مسکراتا رہا —— !

اور کملا اس کی طرف دیکھتی رہی —— !!

صبح کو جب برج ناتھ کملا کے کمرے میں کھنکارتے ہوئے داخل ہوئے۔ تو وہاں کملا نہ تھی۔

وہ ششدر رہ گیا —— !

پاس پڑے رجسٹر پر ایک پرچی تھی ——

" میں جا رہی ہوں —— نریندر کے ساتھ، کہاں؟ یہ مجھے معلوم نہیں ہاں اتنا معلوم ہے کہ اس سماج سے دور جا رہی ہوں۔ جہاں مجھ جیسی نہ جانے کتنی بد نصیب لڑکیاں گھٹ گھٹ کر جان دینے پر مجبور ہیں۔

" کملا "

" کملا —— " !!! وہ چیخ کر نیچے رجسٹر داں پر گر پڑا۔ اور اس کی بیوی اور دو کنواری لڑکیاں دوڑ کر گھبراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئیں —— !

اس نے چار بجے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا، اس کا جسم تازہ گلاب
کی طرح کھل اٹھا، چمپئی رنگ کی ایک نئی ساڑی میں ملبوس اس کا لہراتا ہوا بدن
خوبصورت انداز میں گندھے ہوئے گھنے ریشمی بال، بادامی آنکھوں میں کاجل
کی ہلکی سی تحریر، رخساروں پر ہلکے غازے کی سرخی ——— اس نے
ہزار زاویے سے اپنی جوانی اور حسن کو آئینے میں دیکھا۔ وہ مسکرائی اور لجا کر
آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اب وہ اکتیسویں سال میں قدم رکھ رہی ہے
آج بھی وہ حسین ہے اور جوانی کے انگارے اس کے بدن میں سلگ رہے ہیں
یہ سوچ کر وہ کھو سی گئی ——— سوچ ہی انسان کو وقت سے پہلے بوڑھا
بنا دیتی ہے، تلخ! شکستہ اور مریضانہ سوچ، یہ سوچ کئی برس سے اسے اندر ہی اندر
کھوکھلا کر رہی تھی، اس کا جسم برف کی ایک سل بن گیا تھا، اور اس کی روح میں
سنگیت کی امڈتی ہوئی لہریں منجمد ہو چکی تھیں۔ سنگیت مر چکا تھا، اور ——— اور
وہ بھی مر چکی تھی، لیکن سچ! وہ تو ایک سپنا ہے، وہ زندگی بن کر آیا، سنگیت کی
لہریں جاگ اٹھیں، قوسِ قزح کے رنگ چمکے وہ پھر دس بارہ سال پہلے کی مرلا

ہو گئی، اپنے آنچل میں ایسے خوابوں کے پھول چننے والی۔ اس کی سوچ میں حسن آ گیا، حسن اور توانائی! جب سوچ میں بہار آتی ہے تو انسان کا ہر لمحہ ابدی بن جاتا ہے ——— پھر وہی سوچ؟ خوب! ارے دیر ہو گئی ساڑھے چار۔ تو بج چکے ہیں، روپا بھی کالج سے آ رہی ہو گی، آ سے اب جانا چاہیئے، دیپ بیقراری سے اس کا منتظر ہو گا ——— اس بار تمہیں اپنے فن کا کمال دکھانا ہے سرلا! دیپ نے کل کہا تھا، اور شرم سے اس کے چہرے پر چنگاریاں دوڑ گئیں، وہ اسے کیا کہتی، اس نے پچھلے دو سال سے کنسرٹ واپس کر دیے ہیں اب اس کا کہیں پروگرام نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ روپا کے اصرار پر ستار گود میں لیتی ہے، صرف روپا کے لیے، وہ روپا پر کیوں ظلم کرتی؟ اسے روپا میں ایک ابھرتی ہوئی گلوکار دکھائی دی تھی، اس کی تھوڑی سی توجہ اور دلچسپی سے وہ فن کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے۔ چند ہی برسوں میں وہ موسیقی کے اسرار و رموز سمجھ چکی تھی، لیکن خود اسے ایک عرصے سے اپنے فن، اپنے آپ سے وحشت سی ہوتی رہتی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے ہونٹوں کو کوئی حرکت نہ ہوئی۔

وہ ٹھیک وقت پر سنگیت اکادمی پہنچی، دیپ باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا، اس نے پیار بھری مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا، پروگرام، ساڑھے پانچ بجے شروع ہو رہا تھا، وہ اس کمرے میں بیٹھی، جہاں دوسرے آرٹسٹ بھی تھے، ہال میں لوگ جمع ہو رہے تھے، وہ چاہتی تھی کہ پروگرام جلد شروع ہو اسے پورا یقین تھا، کہ اس کی پرفارمنس خاصی کامیاب ہو گی، اور پھر دیپ بہت مسرور ہو گا، اس کے دل دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

پروگرام شروع ہونے تک دیپ کئی بار اسکے پاس آیا مسکراہٹ کی روشنی

بکھیرتا ہوا، وہ بہت مصروف تھا اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا، پروگرام شروع ہوا اور اناؤنسر نے اعلان کیا کہ مشہور کلاکار سرلا دیوی بھی اِس پروگرام میں شرکت کر رہی ہیں، یہ نام سن کر ہال لوگوں کی تالیوں سے گونج اٹھا، سرلا کے چہرے پر کئی رنگ بکھرے، اور ہیتج مسکرایا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں فخر کی چمک آئی، اور جب قمقموں کی جگمگاتی سبز روشنی میں سرلا دوسرے سازندوں کے درمیان ستار کے تاروں پر زخمہ زن ہوئی تو لوگ بے خود سے ہو گئے۔ سرلا کے دل کی آگ، ستار کے تاروں میں ڈھلنے لگی، فضا پر رنگ و نور کی لہریں رقص کرنے لگیں۔ وہ شکیل کی ایک غزل کے ایک ایک شعر میں اپنی روح کا سارا سوز و گداز، بانکپن اور تاثیر سمونے لگی۔ اُس کی آواز میں جادو تھا، پھول برس رہے تھے، اور دل کیف و مستی میں ڈوب رہے تھے۔ سرلا کی آواز میں کنوارے پن کا تقدس تھا، نرمی اور شیرینی تھی ——— ہیتج احساسِ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ سرلا اُس کی تھی، صرف اُس کی! اور وہ اُس کے فن کی لطافتوں کا مالک ہے، اُس کا مختار!
وہ اُسے جیت چکا تھا، اور جب پروگرام ختم ہوا، ساز خاموش ہو گئے، نغموں کی لہریں ڈوب گئیں تو کمرے میں ہیتج اور سرلا بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"تمہیں پا کر میں نے سب کچھ پا لیا ہے، تم سنگیت کی دیوی ہو، سرلا!"
ہیتج اُس کے بہت قریب بیٹھا تھا، اُس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

وہ خاموش تھی، یہ جملے وہ کئی بار ہیتج کی زبان سے سن چکی تھی۔ اور ہر بار اُسے محسوس ہوا، جیسے اُس کی زندگی کی ویرانیوں میں بہار آئی ہے، اور آج ——— ؟ آج وہ ہیتج کی زبان سے کچھ اور سننا چاہتی تھی، کچھ اور!

اُس کا دل ڈوب رہا تھا، اُس کے خیالوں میں لرزش تھی، اُس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا، تیج ایک خوبرو اور خوش اخلاق آدمی تھا، تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے اکادمی کی شہرت کو بام عروج پہ پہنچا دیا تھا، آج شہر کے تک بھگ سارے فنکاروں کا تعاون حاصل ہو چکا تھا، اور جب سے وہ سرلا سے مل چکا تھا، اُس کی شخصیت کے نقوش اُس کے دل میں بیٹھ گئے تھے، تیج نے نہایت بے تکلفی سے کہا تھا کہ اُسے سرلا کی ضرورت ہے! وہ مل کر اکادمی چلا ئیں گے، اور ہمیشہ ساتھی رہیں گے! کیا اُس کی باتوں میں جادو تھا؟ جادو نہیں، خلوص، خلوص کی روشنی ــــــــ یہ روشنی اُسے کہیں نظر نہ آئی تھی، اُس روشنی کے دھارے کے ساتھ وہ بہہ نکلی۔ یہی اُس کی منزل ہے، یہی اُس کی تقدیر ہے! اور وہ خود بھی آگے بڑھی۔ اپنی تقدیر کی تابانیوں کو دامن میں سمیٹنے کے لئے! اب کے ذرا بھی کوتاہی ہوئی، تو روشنی کا یہ دھارا نہ جانے کہاں کھو جائے گا، اور ــــــــ اور وہ پھر کہاں تاریکیوں میں جھکتی پھرے گی، کب تک؟ اُسے اندھیروں سے نفرت ہے، نفرت! وہ اُجالوں کی متوالی ہے، اُجالے ــــ!! اُس نے پیار سے چھلکتی ہوئی نظر تیج کے دمکتے ہوئے کلین شیو چہرے پر ڈالی، وہ کھوسی گئی، نرم نرم اُجالے۔ لیکن، لیکن وہ اُجالوں کے اُس پار تاریکی ہے، تاریکی کے دیوتا، یہ کب تک اُس کا تعاقب کرتے رہیں گے؟ ــ

ریڈیو کے مسٹر کمار، مشہور شاعر ــــــــ تمہاری آواز میں جگنوں کا اُجالا ہے، نور میں نہلوا، کانپ رہی ہے سرلا ــــــــ رات کے دس بجے سٹوڈیو کے ایک کمرے میں وہ بیٹھا اپنے ہاتھ میں لے کر وہ شاعرانہ تصورات میں کھو گئے تھے، اور جب سرلا نے دبی آواز میں شادی کی بات

تو اُن کے شاعرانہ خیالات بکھر گئے —— اور پھر پروفیسر داس ——
سرلا دیوی آپ اِس دور کی عظیم فنکار ہیں! وہ فن کی اہمیت پر عالمانہ تجزیہ کرنے کے بعد بھی کہتے، اور جب سرلا کے ریٹائرڈ والد صاحب نے اُنہیں سرلا کے لئے شادی کا پیغام بھجوایا، تو وہ ایسے غائب ہوئے، جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

اور پھر —— وجے —— اُف! تاریکی کے بھوت ——!

وہ کانپ اُٹھی!

"کیوں سرلا، خیریت ہے؟"

"جی —— جی کچھ نہیں" وہ سنبھل گئی، مجھے سہارا دیجئے، مجھے روشنی کی ضرورت ہے، یہ تاریکی کے بھوت میرا تعاقب کرتے ہیں، انہیں گولی مار دیجئے، مجھے اپنی مضبوط باہوں میں چھپا لیجئے، میں صرف کلاکار نہیں عورت ہوں، میری زندگی ہے، میرے ارمان ——"

"اب تو تمہیں دیر ہو رہی ہے" وہ سرلا پر قدرے جھک گیا تھا۔ "تم جاؤ گی اب، سچ کہدوں، جی نہیں چاہتا تمہارے بغیر کوئی لمحہ گزرے!"

اُس کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں، اچانک وجے نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کئی مہینے بیت گئے!

سرلا مسرور تھی، اُس کی دھڑکنوں میں نغموں کے غنچے چٹک رہے تھے، وہ تین وقفوں کے بعد اکادمی میں اپنا پروگرام پیش کرتی، روپا بھی وہاں اپنا پروگرام پیش کر چکی تھی۔ اُس کے فن کو بھی سراہا گیا۔ سرلا پھولی نہ سمائی، اس کی خود اعتمادی اُسے واپس مل گئی تھی۔ اس نے ریڈیو

کے بھی چند کنٹریکٹ منظور کر لئے تھے۔ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھول چکی تھی، اس نے تاریکیوں کو لاشعور کی پہنائیوں میں گم کر دیا تھا، روشنی کی منزل اس کے سامنے تھی۔ وہ دن رات اپنے فن کو نکھارنے میں مصروف رہتی، اُسے بے اندازہ روحانی سکون ملتا۔ اُس کے نغموں میں رعنائی اور زندگی مچل اٹھتی، اُسکی آواز میں چاندنی تھی، چاندنی نکھر رہی تھی، اب اُسے صرف اُس دن کا انتظار تھا جب پنچ اُسے دُلہن بنا کر گھر لے جائے گا، اور پھر وہ دونوں مل کر سنگیت اکادمی کے لئے دن رات ان تھک کام کریں گے، یہی اُن کی آرزو تھی۔ کتنے ملتے جلتے ہیں اُن کے خیالات! گویا وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں، واقعی وہ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، کتنی بار پنچ اُس سے یہ بات کہہ چکا تھا۔ اور وہ خود بھی محسوس کرتی تھی، پنچ اُس کا دیوتا ہے، اور وہ خیالوں میں اُس کے چرنوں کو چھوتی ہے پیار اور عقیدت سے سرشار ہو کر اور آج ——— آج بھی وہ پنچ سے ملنے جا رہی ہے اب تو دیر ہو رہی ہے، وہ جلدی سے اُٹھی، آئینے کے سامنے آئی، اُس نے گھنے جھکتے ہوئے بالوں کو گوندھ لیا، کیا اُس کے بال ریشم کی طرح نرم ہیں! کیا ان میں خوابوں کا جادو ہے! ہوگا، اُسے نہیں معلوم۔ پنچ کو تو اس کی ہر چیز پیاری لگتی ہے ——— بادامی آنکھیں، گلابی رخسار، شرابی ہونٹ ——— اور نہ جانے کیا کیا! وہ تو پورا شاعر ہے، یہ شاعر بھی کتنے پگلے ہوتے ہیں! وہ مسکرائی۔

دوسرے لمحے وہ تیار ہو گئی۔ جانے سے پہلے اُسے روپا کو کہنا چاہئے کہ وہ آج ذرا دیر سے لوٹے گی، پتاجی آئیں گے تو ان کے لئے چائے وقت پہ تیار کرے وہ گنگناتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر وہ ڈیلیز پار کر کے دوسرے کمرے میں آئی، جہاں روپا پڑھتی تھی اور سوتی تھی۔ وہ اندر آئی، روپا وہاں نہ تھی نہ جانے کہاں گئی؟ روپا ——— روپا ——— وہ پکارنے لگی، کوئی جواب نہ پا کر وہ واپس ہونے

لگی، دیوار کے ساتھ ستار اور ہارمونیم تھے خاموش خاموش! شاید وہ اپنی ہم جماعت سہیلی کے پاس گئی ہے، وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ستار بجا رہی تھی۔ اُس کی نظر پھر ستار سے ٹکرائی، وہ رُک گئی، ستار کے پاس کاغذ کا ایک رنگین پرچہ تھا وہ نزدیک آگئی، دوسرے لمحے اُس کے ہاتھ میں ایک مختصر خط تھا، تیج کے ہاتھ کا لکھا ہوا،

روپا کے نام ——

میری گڑیا!

تمہیں کو پاکر میں نے سب کچھ پا لیا ہے، تم سنگیت کی دیوی ہو، تم شاید کل میری باتوں سے بُرا مان گئیں۔ تم خاموش ہو گئیں محبت کے جذبات میں نہ جانے میں کیا کیا کہہ گیا، اتوار کو سرلا دیوی نہیں آ رہی ہیں، تم آنا ضرور، انتظار کروں گا! ——

تیج

اُف!!

سرلا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اُس کے دل کی دھڑکن رک سی گئی، یہ خواب تو نہیں!

نہیں، یہ حقیقت ہے! خط اُس کے ہاتھ میں ہے، اُف! —— اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے زیر و زبر ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر جاتی۔ وہ فوراً ایک کواڑ کا سہارا لے کر، کمرے سے نکلی گرتی پڑتی سیدھی اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے فرش پر گر پڑی۔

وہ ایک حیات شکن تلاطم سے گزر رہی تھی!

اور جب وہ اُٹھی، تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ کمرے پر اندھیرے لپک رہے تھے، وہ اِن اندھیروں کو دیکھتی رہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ——
وہ چیخنا چاہتی تھی، اُن اندھیروں کا گلا گھونٹنا چاہتی تھی، لیکن اُس کے ہونٹ ساکن تھے۔ وہ پھر فرش پر گر پڑی۔ اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کی حساس، جذباتی کلاکار سرلا مر چکی ہے، سنگیت مر چکا ہے، اور اُس کی لاش زندہ ہے —— لاش —— !

لیکن رُوپا ——؟

کیا وہ بھی مر جائے گی؟

—— نہیں۔ نہیں، رُوپا اُس کی بہن ہے، وہ اُسے مرنے نہ دیگی، وہ ایک عورت رہے گی، صرف عورت! کلا عورت کو موت کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی، ایک پاگل کی طرح، اور لپک کر ہانپتی ہوئی، کمرے سے نکلی، اور روپا کے کمرے کی طرف دَوڑی، دروازہ بند تھا، وہ زور زور سے دونوں ہاتھوں سے، دروازہ کھٹکھٹانے لگی،

دروازہ کھُل گیا!

روپا گود میں ستار لئے، دنیا و مافیہا سے بے خبر، ایک دلگداز اور اُداس دُھن بجا رہی تھی، اُس کے بال کھُلے تھے، اور شانوں کے لہراتے ہوئے دائیں بازو پر گھٹا بن کر بکھرے تھے، اُس کے کنوارے رخساروں پر جذبات کی قوسِ قزح تھی، اُس کی پلکوں پر ستارے تھے، اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے چاند جیسے چہرے پر ڈھلک رہے تھے!

سرلا نے رُوپا کو اِس حال میں دیکھا، وہ دیکھتی ہی رہی —— حیران سحر زدہ، خاموش!!

ایک طویل لمحہ گزر گیا ــــــــــ

نغمے کی لہریں تھرتھرا کر بکھر گئیں!

"کیوں باجی! کب تو ٹیں اکا دمی سے؟"

روپا مچل کر سرلا کے پاس آئی، اور بازو اس کی گردن میں ڈال کر بولی۔

سرلا اسے دیکھتی رہی، کھوئی کھوئی سی، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا ــــــــــ!

⇔ ⇔ ⇔

چائے پی کر اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جسم میں نئی زندگی اور توانائی آگئی ہے وہ ابھی سے گھر جا کر کیا کرے! بنڈر روڈ پر ٹہلنا بھی بے کار ہے۔ باہر چبھتی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ شام کے خنک اور پُر اسرار سائے ویرانی پھیلا رہے ہیں۔ ہوٹل اب برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اُسے وہاں یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ جیب سے ڈبیا نکال کر اُس نے سگریٹ سلگایا۔ اور دھوئیں کے سُرمئی دائرے بنانے لگا اِس ہوٹل میں اب وہ کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ آج سے دو برس پہلے اُس کی شامیں یہیں گزرتی تھیں۔ اُداس اُداس شامیں، لیکن اب! اب تو دفتر سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا گھر کا رُخ کرتا ایک نئی مسرت کے ساتھ وہ گھر لوٹتا۔ ایک نئی ترنگ کے ساتھ شانتی اُس کا انتظار کرتی ہے۔ شانتی اُس کی رُوح کی جنت ہے۔ اُس کا گھر بھی جنت بن گیا ہے۔ گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر شانتی اُس کے قریب آتی ہے بہار کا ایک نغمہ بن کر، اور ______ اور وہ گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں۔ آرٹ کے متعلق، موسیقی کے بارے میں موسیقی میں اُسے سہگل بہت

پسند ہے۔ اور جب وہ کہا کرتی کہ اُس کی مقبولیت کو دیکھ کر اُس کے دشمنوں نے اُسے سرمہ کھلایا۔ تاکہ اُس کا گلا بیٹھ جائے۔ تو اُس کی آواز بھرّا جاتی ـــ بھی سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے! مہندر کہتا اور دونوں ہنس پڑتے اور پھر وہ دیر تک اپنی زندگی کے بارے میں باتیں کرتے۔ پیار کی باتیں، شانتی کو پاکر اُسے کسی اور چیز کی آرزو نہ تھی۔ جب عورت دل کا قرار بنے تو زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، شانتی اُس کی زندگی میں نہ آتی تو وہ کیا کرتا؟ کسی دوسری عورت کو وہ کیسے پیار کرتا۔ جنم جنم سے روحوں کے ملاپ کی بات سچی نہ ہوتی تو پھر کیسے چند ہی مہینوں میں اُن کی شادی ہو جاتی۔ شانتی کو اُس نے دو بار ریڈیو پر سنا تھا۔ اور دونوں بار وہ کھو سا گیا تھا۔ اُس کی آواز میں نغموں کی دوشیزگی ہے۔ روح میں اُترنے والی آگ۔ وہ غالب کی غزل گا رہی تھی۔ اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کچھ کھوئی ہوئی یادوں سے اُلجھ رہا تھا۔ یہ کیسی یادیں تھیں! کس جنم کی یادیں!

یہ آواز اُس کی روح کی بھٹکی ہوئی آواز تھی، اُف! ـــــ اور پھر اُس نے سنگیت سبھا کی سالانہ کانفرنس میں شانتی کو دیکھا۔ چہرے پر خلوص اور افسردگی کا دقار بنے۔ لمبی لمبی پلکیں حیا سے جھکی جھکی سی۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ اُس لڑکی کو دیکھ کر وہ لرز اُٹھا۔ یہ وہی تو تھی، اُس کے خوابوں کی دیوی، کچھ اجنبی سی۔ کچھ جانی پہچانی۔ اور جب دو مہینوں کی مسلسل تگ و کاوش کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ شانتی، ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ باپ ریٹائرڈ کلرک اور وہ محض اس لئے شانتی کی شادی نہیں کر سکا کہ اُس کے پاس بہت سا روپیہ نہیں۔ تو اُسے اطمینان ہو گیا کہ شانتی اُس کی ہے۔ اور پھر ـــــ؟

شانتی سے اُس کی شادی ہو گئی۔

شانتی معمولی عورت نہ تھی، وہ ایک کلاکار ہے۔ اُس کی رُوح میں، عظمت ہے گُداز ہے، حُسن ہے۔ اُس کا سر شانتی کے قدموں پر جُھک گیا وہ ہمیشہ سے فنکاروں سے پیار کرتا رہا۔ فنکار کی رُوح سے روشنی پھوٹتی ہے اور اُس کی محبوب بیوی ایک فنکار ہے ——— فنکار! وہ روشنی کی لہروں میں ڈوب ڈوب جاتا! اور جب کبھی وہ رات کی جھکتی ہوئی تنہائیوں میں ستار کے نشیلے نغموں میں اپنی رُوح کا جادو ملا لیتی ہے تو پھول برستے ہیں اور

"ہاہا ——— ہی ہی ہی ———"

کونٹر کے مقابل میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے چند آدمیوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ چونک اُٹھا۔ روشنی کی لہریں پھیل گئیں، غائب ہو گئیں۔ عجیب آدمی ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں، گنوار!

وہ اب بھی ہنس رہے تھے۔ اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

اُسنے نفرت سے اُن کی طرف دیکھا، ایک ہٹا کٹا جوان، بار بار اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتا۔ ادھیڑ عمر کا ایک سوکھا سا آدمی۔ ایک اور آدمی، پرانا سا طرّی جسٹر پہنے ہوئے ——— اِتنے میں کونٹر پر بیٹھا ہوا منشی ریڈیو کی سُوئی گھمانے لگا اناؤنسر اعلان کر رہا تھا ——— "ابھی آپ امرچند سے ایک ٹھمری سن رہے تھے، اب شانتی جی سے ایک غزل سُنیئے۔"

شانتی؟

اُس کے کانوں سے جیسے چوڑیوں کی میٹھی جھنکار ٹکرائی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ سات بجکر دس منٹ ——— ہاں یہی تو وقت ہے۔ اُس

کی آنکھیں مسکرائیں اور اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ شانتی کی آواز میں نورس کلیوں کی نغمگی تھی۔ سورج کی پہلی کرنوں کا جمال تھا۔ شبنم کے موتیوں کی دمک تھی۔ چشمِ غزالاں کا جادو تھا۔ وہ کھو سا گیا، روشنی کی لہروں میں۔ اور ———

اور لمحے پرواز کر گئے۔ نغمے ڈوب گئے۔ کلیاں بکھر گئیں ——— !

"بھئی خوب گاتی ہے سالی، لیکن چہرے سے تو لتا منگیشکر ———"

ایک نوجوان بولا۔ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے۔

اچانک وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو۔

"چھوڑو یار لتا منگیشکر کی بات ———" دوسرا آدمی بولا "یہ عورت نہیں قیامت ہے، قیامت! سالی کو ایک بار دیکھو تو پاگل بنا دے گی"۔

"بھئی عجیب چیز ہے واللہ!" ——— مڑی چہرے والا آدمی بولا۔ "ایک دو بار اسے گاتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن ———"

"لیکن کیا؟"

"سالی ہے لفٹ کسی کو نہیں دیتی"

"کبھی قسمت آزمائی ہے؟"

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کی کنپٹیاں سرخ ہو گئیں، اس کے ہونٹ کانپنے۔ ایک غلیظ سی گالی اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اور وہ پسینے پسینے ہو کر ہوٹل سے نکل گیا۔

باہر بہت ہی سرد اور ویران شام تھی۔

وہ جب گھر پہنچا تو بے حد تھکا تھکا سا تھا۔ جیسے وہ کوئی عزیز چیز کھو کر آیا ہے۔ وہ گم سم بیٹھا رہا۔ اس کی روح میں ایسی بے چینی تھی، یہ کیسی بے چینی ہے؟

اُف، آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا اُسے؟ جیسے کوئی بڑی بات ہو گئی ہے جیسے، جیسے خدانخواستہ، لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ چند آوارہ قسم کے لوگوں کی بہکی بہکی باتیں۔ چھی چھی کتنی بے ہودہ بات۔ ایسی باتوں پر سوچنا حماقت ہے حماقت نہیں تو اور کیا ہے! وہ مسکرایا۔ اور اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اندھیرے چھٹ گئے۔ اُس نے لمبی سانس کھینچی اور رومال سے پسینہ پونچھا۔ شانتی آ رہی ہو گی، اُس کی جانِ عزیز، اور وہ اُسے سنائے گا کہ چند لفنگے کیا کہہ رہے تھے وہ قہقہہ لگائے گی اور پھر دونوں کے قہقہے ——۔ اتنے میں سیڑھی پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور دوسرے لمحے شانتی مسکراتی ہوئی اندر آئی۔

"دیر تو نہیں ہوئی؟" وہ مسرور تھی۔

"نہیں تو ——" نہ جانے اُسے کیا ہو گیا۔ الفاظ اُس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔

"آپ چپ سے کیوں ہیں، طبیعت ——؟"

"میں ٹھیک ہوں" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہنے لگا۔ ابھی ہوٹل سے چائے پی کے آیا۔ اور وہیں تمہارا پروگرام ——"

"سُن لیا نا؟ خوب! ——" شانتی کے چہرے پر مسرت کے گلاب کھل اُٹھے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"مسٹر دیال کہہ رہے تھے، آج میرا ITEM خوب رہا، بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ تمہیں کیسا لگا؟ وہی غزل تھی جو میں نے اچھابل میں سنائی تھی۔"

"بہت اچھا رہا ——" وہ بے چین ہو گیا۔ مسٹر دیال اتنی تعریفیں کر رہے تھے۔ اُف! اُسے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ اور شانتی کپڑے بدل کر رسوئی میں چلی گئی۔

دو مہینے گزر گئے ـــــــــ

خط شانتی کے نام تھا۔ لیکن وہ آج فلڈ ریلیف فنڈ کے سلسلے میں موسیقی کے پروگرام میں حصہ لینے گئی تھی۔ چار بجے وہ واپس آرہی تھی۔ اُس نے خط سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ سنگیت سبھا والوں نے مجبور کیا ہے آج آخری پروگرام ہے۔ آپ بھی آیئے۔ ویسے چار بجے تک میں واپس آؤں گی۔ آپ چائے گھر پر ہی پی لیجئے۔"

صبح دس بجے شانتی نے کہا تھا۔ وہ دفتر جا رہا تھا۔ "اچھا ـــــــ" وہ مسکرایا۔ جہنم میں بھیج دو سنگیت سبھا کو۔ کہاں جاؤ گی تم؟ میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں سے کوئی چیخا لیکن اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھیکی سی ویران مسکراہٹ۔

اور وہ چلدیا۔ شانتی قدرے مایوس ہوئی۔ آج بھی اُس نے نکلتے وقت اُسے پیار نہیں کیا تھا۔ وہ شرمائی، اور گنگناتی ہوئی کام میں لگ گئی۔ وہ دِن بھر پریشان رہا۔ نہ جانے کیوں۔ دوپہر کے بعد اُس نے رخصت لے لی۔ تاکہ سنگیت سبھا میں جائے۔ لیکن وہ وہاں جانے کے بجائے گھر آگیا۔ کیوں وہ وہاں نہیں گیا؟ خواہ مخواہ خیالوں میں اُلجھنا کہاں کی دانائی ہے کتنا واہی ہو گیا ہے وہ! لیکن اُسے کونسا وہم ہے! کیا پریشانی ہے؟ ـــــ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ ٹھیک ہے، سب کچھ اپنے معمول پر ہے۔ یہ سوچ کر اُسے سکون سا ملا۔ اور وہ سنگیت سبھا جانے کے لئے تیار ہوا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن یہ خط؟ کیوں نہ وہ اِسے پڑھ لے، کیا وہ شانتی سے الگ ہے؟ نہیں تو ـــــــ اُسے شانتی پر پورا حق ہے۔ وہ اُس کی بیوی ـــــ اُس نے اچانک خط کھولا۔

شریمتی شانتی جی!

آپ کے پروگرام بہت شوق سے سنتا ہوں جس دن آپ کا پروگرام ہوتا میں خوشی سے ناچتا ہوں۔ آپ کی آواز میں نہ جانے کون سا جادو ہے۔ مدت سے آپ کو دیکھنے کی آرزو ہے۔ میں آپ کے فن کی عظمت کا پجاری ہوں۔ کاش آپ کبھی ملاقات کا شرف بخش دیتیں۔

آپ کا مدّاح

کرشن داس

خط پڑھ کر وہ بوکھلا سا گیا۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ لیکن بے چین ہونے کی کیا بات ہے؟ ایسے خطوط تو آتے ہی رہتے ہیں۔ بعض خطوط میں تو کچھ دل پھینک لوگ پیار کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اور شانتی خط پڑھ کر ہنستی ہے اور خط پھینک دیتی ہے۔ وہ کئی بار دونوں آرٹ کے ان انجانے عاشقوں کی دیوانگی پر قہقہے لگا چکے ہیں۔ شانتی سچ کہتی ہے، اس زمانے میں ایک ہی چیز بہت سستی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور وہ ہے پیار کا ناٹک، محبت کا کھیل۔ لیکن یہ کرشن داس؟ ہوگا کوئی اُلّو کا پٹھا۔ کیوں وہ اس کے بارے میں سوچتا ہے؟ سوچا ہوگا اس نے، چلو ایک خط لکھیں، کیا جاتا ہے اپنا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ شانتی کسی کی امانت ہے۔ وہ ایسی ویسی عورت نہیں وہ تعریف کے چند جملوں سے پھول نہیں جاتی۔ ارے، پھر وہی بے ہودہ پن ——— ! لیکن یہ کرشن داس کا بچہ کون ہوتا ہے شانتی کو خط لکھنے والا۔ نہ جان نہ پہچان، اُس کے ماتھے کی شکنیں تن گئیں۔ وہ آج ہی شانتی سے بات کرے گا۔ آئندہ کوئی خط ——— لیکن شانتی کا اس میں کیا قصور؟ وہ کب کہتی ہے ان بے کاروں کو کہ تم ایسے لمبے چوڑے خطوط

لکھو ـــــــ پھر کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا؟ ـــــ وہ پاگل سا ہو گیا ـــــ۔ اس نے خط اٹھایا اور غصّے اور نفرت میں اُسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ ٹکڑوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ پریشانی میں ڈوبا بیٹھ گیا۔ کمرے میں سنّاٹا تھا، سنّاٹا اور ویرانی! ـــــ وہ جاتی ہے تو گھر ویران سا ہو جاتا ہے۔ وہ کیوں جاتی ہے؟ وہ اُس سے کہے گا۔ دیکھو شانتی، تم آئندہ کسی پروگرام میں شرکت نہ کرو۔ یہ میری مرضی ہے۔ اور وہ مسکرا کر کہے گی جو آپ کی مرضی! لیکن اگر وہ وجہ پوچھ لے گی، تو ـــ؟ اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

تین دن گزر گئے ـــــ یہ تین دن اُس کے لئے قیامت سے کم نہ تھے وہ پاگل ہو گیا تھا۔ گھر دیر سے آتا۔ چند باتوں کا سرسری جواب دے کر تھوڑا سا کھانا زہر مار کرتا۔ اور سونے کے بہانے بستر میں جاتا۔ لیکن نیند کہاں؟ وہ آج بھی دیر سے آیا تھا۔ شانتی اُس کے لئے سراپا انتظار تھی۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے۔ اور جب اُس لئے کریدنا چاہا تو وہ ٹال گیا۔ وہ چپ رہی۔ آج بھی اگر وہ اداس نظر آئے تو وہ پوچھ کر رہے گی۔

اور جب وہ آیا تو اُس کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

لیکن آج جب وہ آیا تو وہ مسرور تھا۔ خلافِ توقع۔ اُس کے دل سے ساری بے چینی کافور ہو چکی تھی۔ اُس کے چہرے پہ پہلی سی رونق تھی۔ تازگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ وہ آج شانتی کے لئے ایک نیا سوٹ لایا تھا۔ اور مٹھائی کا ایک لفافہ ـــــ اور جب رات

کی زلفیں کائنات کی چھاتی پر بکھر گئیں۔ خوابوں کا فسوں جاگ اُٹھا، تو کمرے
کی مہکتی ہوئی فضا میں مہندر کے سامنے شانتی اپنے ستار کے سلگتے ہوئے تاروں
پر ایک گیت گا رہی تھی۔ اُس کے کھلے چمکتے ہوئے بالوں کا آبشار اُس کے
سینے کے نشیب فراز سے ہو کر اُس کے دامن میں گر رہا تھا۔ اُس کی سرمگیں
پلکوں پر خمار اور چہرے پر وقار تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے نغموں کے پھول
برس رہے تھے۔

تم خفا ہو جاتے ہو محبوب۔
میری کائنات اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔
نغمے مر جاتے ہیں۔
تم پاس آتے ہو مسکراتے ہوئے۔
محبت کے اُجالے رقص کرتے ہیں۔
نغموں میں جان آتی ہے۔
آؤ تمہارے قدموں پر اپنا سر رکھ دوں میرے محبوب!

اور مہندر اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ شانتی کے سحر آفریں جال میں کھو
گیا تھا۔ اُس کی رُوح میں اُجالے تھے۔ شانتی اُس کی تھی۔ ایک عظیم عورت!
وہ اُسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اُسے اور کیا چاہئے؟
اور جب گیت ختم ہوا اور مہندر نے پیار سے شانتی کی آنکھوں میں
دیکھ کر کہا۔ "میری شانتی!"
تو جیسے نغمے جاگ اُٹھے ——— رات کی دھڑکنوں میں ستارے
ٹوٹتے رہے ———!
جب صبح کو مہندر نہا دھو کر آیا۔ اُس وقت شانتی بستر میں لیٹی تھی۔

ہندر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"تم ابھی تک ——————" وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

اور شانتی خاموش رہی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

وہ اُسے دیکھ رہی تھی ——————

مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں میرے دیوتا! آپ نے اچھا کیا، میرے گلے میں جاگتے ہوئے نغموں کو سُلا دیا۔ نغمے مر گئے۔ لیکن میں اب بھی زندہ ہوں مجھے کیا معلوم تھا یہ نغمے آپ کو مجھ سے چھین رہے ہیں۔ یہ نغمے اِسی قابل تھے اِن سے زیادہ مجھے آپ پیارے ہیں۔"

اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

پیار سے معمور اور شفاف آنکھیں!

اِن آنکھوں میں اتنا سکون کہاں سے آیا تھا؟

وہ کانپ اُٹھا۔

اور اُس کی آنکھوں کے سامنے کل رات والا مٹھائی کا لفافہ آرہا تھا ——— مٹھائی کے تہہ در تہہ پردوں میں چھپے ہوئے سرمے کی تحریر: زہر! نغموں کا قاتل!!

اس کے جسم سے پسینے چھوٹنے لگے!

——— ⁂ ———

فردوسِ گُم شُدہ

میں دانتوں پر برش پھیر رہا تھا، اور باتھ روم کے قریب آرہا تھا، ہوٹل کے کھلے برآمدے پر دسمبر کی صبح کی خنک اور نرم روشنی پھیل چکی تھی، دور، سیڑھی سے ناتھو جی، ہوٹل کا سعمر بوڑھے میرے لئے گرم پانی کی بالٹی لا رہا تھا۔ میں نے سامنے کے باتھ روم کی طرف نظر اٹھائی، دروازہ بند تھا۔

سارے ہوٹل میں یہی اچھا، کھلا، صاف ستھرا باتھ روم تھا، اور میں اسی میں نہاتا تھا، ناتھو جی سے کہا جائے میں کچھ دیر میں نہالوں گا، میں نے سوچا۔ کھٹاک!

اتنے میں باتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا، باتھ روم سے ایک سرو قد عورت بلاوزا ور سفید رنگ کی ساڑھی پہن کر نکلی، ایک مجسم قیامت بن کر! اس کے لمبے بال کھل کر اس کے گداز شانوں پر بکھرے ہوئے تھے الجھے الجھے گھنے بال، جن پر صاف و شفاف پانی کے موتی چمک رہے تھے۔ اس کا گول مکھڑا گلاب کی طرح شگفتہ تھا: اس کی سیاہ

آنکھوں میں ایک گہری جھیل کا سکون تھا، وہ اعتماد اور اطمینان سے دروازے سے نکلی، میری طرف ایک سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

"چلئے صاحب ———" ناتھ جی کی آواز نے مجھے چونکا دیا، اُس کے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگیں، اُس کی پیلی سی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ جیسے وہ کہہ رہی تھیں ——— "صاحب۔ آپ نے دیکھا ہی کیا! کتنی کافر جوانیوں کو دیکھا ہے، یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں،"

"دیکھئے تو پانی کیسا گرم ہے ———"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، جذبات میں ہلچل کے ساتھ باتھ روم میں داخل ہوا، کمرے میں سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، جیسے وہاں عطر گلاب چھڑک دیا گیا ہو۔ یہ قاتل حسن اور یہ پاگل بنا دینے والی خوشبو! میرا ذہن ایک نادیدہ جسم کی مہکتی ہوئی رعنائیوں میں بھٹکنے لگا۔

اُس صبح کو جب میں ناشتہ کے ٹیبل پر بیٹھا، تو اُس وقت بھی اُس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا ——— یہ عورت کون ہے جس نے آج صبح ہی میرے ذہن ضبط پر بجلی گرائی! میرے دل میں آیا کہ ناتھ جی سے اُس کے بارے میں پوچھوں، لیکن میں کچھ نہ پوچھ سکا، ناتھ جی ڈسٹ پر مکھن لگا رہا تھا۔ مجھے اُس پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں نہ خود ہی مجھے اُس کے بارے میں سب کچھ بتا دے؟ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا، وہ چپ تھا۔ شاید وہ ہلکی سی پریزنٹیشن کا منتظر تھا، ہو گا کہ نہیں، کیا معلوم، خواہ مخواہ کیوں دلچسپی لی جائے۔ میں نے جلدی سے ناشتہ کیا، اور کپڑے بدل کر نکلا۔ دروازے پر تالا لگا کر میں آگے بڑھا ——— ارے! وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ بال

اُس نے گوندھ لئے تھے، میں نے اُس کی طرف دیکھا، اُس کی لانبی پلکیں
جُھک گئیں، میں سامنے سے گزرا، اندر اس کے کمرے میں بھنگی جھاڑو پھیر رہا تھا۔
میں آگے بڑھا، دکان میں سب آئے ہوں گے، میرا ذرا بھی دیر سے آنا
باس کو شاق گزرتا ہے۔ ایک ایک لفظ پہ زور ڈال کر کہتا ہے ـــــ تیتش!
وقت کا پابند ہونا ایک سیلز مین کی (QUALIFICATION) ہے، اب اسے کون
کہے، شرمان جی! وقت کی پابندی ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ اس میں
سیلز مین کی تخصیص نہیں۔ عجیب ہیں یہ لوگ۔ اپنے نئے ملازم پر اسی طرح رعب
ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کب تک یہ لمبے لمبے لیکچر جھاڑتے
جائیں گے اور آج ـــــ؟ وہی دکان کا ماحول، خریداروں کا رش، مغز ماری
کاش میں چھٹی پہ ہوتا، یہ پیٹ کا دھندا انسان کی کتنی خواہشوں پہ پانی پھیر دیتا
ہے۔ میں آج ہوٹل ہی میں ٹھہرتا، اور ـــــ اور ـــــ؟
اور پھر کیا ہوتا ـــــ؟ کچھ بھی نہیں، کتنا بے ہودہ پن ہے!
ایک اجنبی عورت کے بارے میں سوچنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا حق پہنچتا ہے
مجھے؟ کسی شریف آدمی کی بیوی ہوگی، دونوں میاں بیوی دہلی کی سیر کو
آئے ہوں گے۔ چند دنوں میں واپس چلے جائیں گے۔
میں دل کو سمجھا رہا تھا۔

دوسری صبح کو ناتھ جی نے میری ہدایت کے مطابق کمرے سے باہر
برآمدے پہ ٹیبل لگا دیا۔ میں چائے کے گرم گرم گھونٹ پی رہا تھا، اتنے
میں وہ کمرے سے باہر نکلی، آج اس نے سنہرے رنگ کے چھوٹے چھوٹے
پھولوں کی ساڑی میں اپنا بدن لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل

لرزی، جھجکی، اور کچھ سوچ کر دھیرے سے پکارنے لگی۔

"گڈی، آؤ، جلدی کرو، تولیہ بھی لیتی آنا"

اتنے میں اندر سے لگ بھگ چار سال کی ایک بچی دوڑتی ہوئی آئی، ننھے ہاتھوں میں تولیہ لئے، بالکل اپنی ماں سے ملتی جلتی ہے۔ کتنی پیاری بچی ہے!

دونوں چلنے لگیں، عورت کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا، وہ نظریں جھکائے چلتی رہی۔ چہرے پر ماممتا کے تقدس کا وقار لئے۔ اور بچی اس کے آگے آگے دوڑنے لگی۔

میں چائے کی پیالی پر جھک گیا، ماضی کے کچھ ویران لمحوں کی پرچھائیاں بھاپ بن کر بکھرنے لگیں، میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی ——
کس طرح بسے ہوئے گھر برباد ہوتے ہیں۔ جیسے ان گھروں میں زندگی کبھی مسکرائی ہی نہ تھی، جیسے کوئی چراغ جلا ہی نہ تھا، میرا گھر بھی دیکھتے ہی دیکھتے لٹ گیا، زندگی اجڑ گئی۔ جیسے یہ ہمیشہ اجاڑ تھی، جیسے چار سال کا عرصہ کچھ نہیں ماضی کے بیکراں سمندر میں ماہ و سال لہریں بن کر ابھرتے ہیں، مٹتے ہیں،
ان چار برسوں میں روپ متی کی رفاقت میں ہر لمحہ مسرتوں کا لمحہ تھا، روپ متی دیوی تھی، صبر اور محنت کی دیوی، اس نے مجھے جینا سکھایا، زندگی کی ٹھوکروں پر مسکرانا سکھایا، میری مسلسل بیکاری اور تہی دستی نے اسے کبھی مایوس نہ ہونے دیا، اس کے ہونٹوں پر کبھی شکایت کا لفظ تک نہ آیا، روکھا سوکھا کھا کے مطمئن رہی، کام کرتی رہی، میرا ہر طرح خیال رکھتی رہی اور —— اور پھر اس کی گود بھر گئی، چاند سی بیٹی، بیٹی کی پیدائش پر وہ روئی تھی، لیکن میں ہنستا رہا۔

اتنے میں وہ بچّی کا بایاں ہاتھ تھامے واپس آگئی، اُس نے بچّی کو نہلایا تھا اور وہ ایک کلی کی طرح نکھر اُٹھی تھی، اچانک اُس نے ایک جھٹکے سے اپنے ننھے ہاتھ کو آزاد کیا اور پھُدکتی ہوئی میرے قریب سے گزری، اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں مشکل میں پڑ گیا، بُت کی طرح خاموش رہنا حماقت ہے، میں نے ہمّت کرکے بہت پیار سے کہا،

"آؤ گڈّی، چائے پی لو ——— آؤ نا!"

"بہت اچھی بچّی ہے یہ!" ناتھو جی نے گرہ باندھی۔

یہ سن کر وہ وہاں سے بے تحاشا بھاگی، اور اس کی ماں ہلکی سی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس مسکراہٹ کی مٹھاس میری رگ و پے میں اُتر گئی۔

روز بروز گڈّی مجھ سے مانوس ہوتی گئی، وہ دور ہی سے مجھے کہتی۔

"انکل، آداب عرض!" ظاہر ہے اس کی ماں نے سکھایا تھا، بڑی سلیقہ مند لڑکی ہے، صاف ستھری، پیاری سی ذہین لڑکی! میں حیران ہو رہا تھا یہ عورت اس بچّی کا کتنا خیال رکھتی ہے۔

"بس اسی کا خیال ہے اسے صبح شام اسی کا خیال! بچّوں کی ماں ہو تو ایسی ——— "ناتھو جی نے ایک دن انفارمیشن دی لیکن جب میں نے پوچھا، یہ اکیلی کیوں ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا شوہر؟ تو ناتھو جی لگا بغلیں جھانکنے۔ دراصل بیچارے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی کہ ایک بار پوچھ لے بائی جی، آپ کے خاوند کب آ رہے ہیں، میں خود پوچھ لیتا، لیکن وہ ابھی میرے

ساتھ زیادہ بے تکلف نہ ہوئی تھی، اُس کی شخصیت کے غیر معمولی ٹھہراؤ اور
سکون نے میرے دل میں احترام کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ بڑی بات
یہ تھی کہ میں کیوں کسی کے ذاتی معاملات میں اُلجھوں۔ گڈی تو اب میرے کرے
میں بھی آتی، میرے سامنے میری چیزوں کو قرینے سے رکھتی، وہ چیزوں کو
اُلٹتی پلٹتی نہ تھی، جیسا کہ بچے عام طور پر کرتے ہیں۔ وہ امی کے لئے کپڑوں کا
برش لے جاتی، کبھی کہتی، "امی آج کا اخبار مانگتی ہیں ——" اور میں اُسے
پیار کرتا، وہ چیزیں لے جاتی، اور پھر واپس لے آتی، ہمارے تعلقات اب قریبی
ہمسایوں کے سے ہو گئے تھے۔ ہم صبح کو ملتے، باتیں کرتے، دن بھر ہم سب
ایک دوسرے سے جدا رہتے، ایک دوسرے کو بھول جاتے، گڈی سکول
جاتی، اُس کی امی، فن، اور میں رنگا ل کلاتھ ہاوس کی مصروفیات میں کھو جاتا
شام کو پھر ہماری ملاقات ہوتی، مجھے محسوس ہوتا، جیسے گڈی میری منتظر ہے
میں اُسے دیکھ کر خوش ہوتا ——!

اس دفعہ میں چار دن ہوٹل سے غیر حاضر رہا، باس نے مجھے ایک
ضروری کام سے کلکتہ کے برانچ آفس کو جانے کے لئے کہا، معاملا ارجنٹ
تھا، اس لئے میں کوشش کے باوجود ہوٹل نہ جا سکا، میں کلکتہ گیا، اور چوتھے
دن واپس آیا ——

اتوار کا دن تھا۔

میں ہوٹل پہنچا، لیکن وہاں گڈی دکھائی نہ دی، دروازہ اندر سے
بند تھا، میں اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پہ دراز ہو گیا، لیکن دل میں بے چینی
تھی، اُن دونوں کی خیریت جاننا چاہتا تھا، نہ جانے یہ باتھ روم جی کا بچہ کہاں

"ہاں، میں تو کب کا آیا ہوں بیٹی ——"، میں ندامت اور شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ "تم اب اچھی ہو گئیں، کل سکول جاؤ گی، ٹھیک ہے نا؟"

وہ مسکرائی۔

اُس کی ماں کی بھیگی آنکھیں بھی مسکرائیں۔

اُس رات کو میں جلدی سو گیا۔

صبح کو نہا دھو کر میں گڈی کی مزاج پرسی کے لئے گیا۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ گڈی کی حالت آج بہت اچھی تھی۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا، اور اُس کی امی کمرے کے ایک طرف کسی کام میں لگ گئیں۔ باتیں کرتے کرتے میں نے کہا۔

"اب تو تمہارے پاپا بھی آئیں گے گڈی!" مجھے ناتھو جی کی بات یاد آئی، ناتھو جی کو معلوم ہو چکا تھا کہ اِس عورت کا شوہر آ رہا ہے۔

"کب آئیں گے؟"

"بس اب تو دیوالی پہ آ ہی جائیں گے۔"

"ہاں، ہاں، ضرور آئیں گے ——" اُس کی امی بولیں، کپڑوں کو تہہ کرتے ہوئے۔

گڈی خاموش ہو گئی۔ اور چھت کو گھورنے لگی۔

وہ دیوالی کی رات تھی۔

دیوالی کی چہل پہل دیکھ کر میں شام کو ہوٹل آیا۔ گڈی کے لئے مٹھائیوں کا ایک لفافہ لایا تھا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ گڈی دوڑتی ہوئی آئی۔

"انکل، دیوالی مبارک ہو!" وہ چہک اٹھی۔

میں نے اسے پیار کیا۔

"امی کہتی تھیں۔ انکل کیوں نہیں آئے؟"

"اچھا، وہ میرے متعلق پوچھ رہی تھیں؟"

"ہاں، اور کیا؟"

"کہاں ہیں وہ؟"

"آپ کے لئے کھانا بنا رہی تھیں، اب کپڑے بدل رہی ہیں۔"

اچانک مجھے یاد آیا کہ کل شام کو اس نے باتوں باتوں میں کہا تھا، گڈی کو مخاطب کرتے ہوئے، کل تمہارے انکل ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے! اور میں انکار نہ کر سکا تھا۔

میں اس کے خلوص اور سادگی سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا۔

"کیا تمہارے پاپا نہیں آئے؟"

گڈی نے نفی میں سر ہلایا، اور وہ ٹیبل پر رکھے ہوئے آئینے میں کھو گئی۔

اتنے میں اس کی امی دروازے پر آ گئی۔

وہ ایک گلابی ریشمی ساڑی میں ملبوس تھی، بالوں کو اس نے ایک ہی لمبی چوٹی میں گوندھ لیا تھا، وہ خاموش تھی، بجلی کی تیز روشنی میں اس کا خوبصورت چہرہ دمک رہا تھا، اس کی آنکھوں کی گہرائیوں پر لمبی پلکیں سایہ ڈال رہی تھیں۔

"آپ؟ —— آئیے، آئیے!"

"گڈی، جاؤ تم کمرے میں رہو، میں آئی۔"

گڈی جانے لگی۔

"یہ لو گڈّی، مٹھائی لایا ہوں تمہارے لئے!"
گڈّی رُک گئی، اُس نے امّی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اُن جھکی جھکی نظروں میں اجازت کی شہ پاکر گڈّی نے مٹھائی کا لفافہ لے لیا، اور بھاگ گئی۔
"آپ کی محبت گڈّی بھول ہی نہیں سکتی، آپ کا نام اُس کی زبان سے اترتا ہی نہیں، آپ نے اُنہیں ——"
وہ جملہ پورا نہ کر سکی۔ اچانک اُس کے لہجے میں ساری دنیا کی اداسی بھر گئی اُس کا شگفتہ چہرہ افسردہ ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک حسین اور جوان عورت کی اُداسی میری برداشت سے باہر ہے، میری رُوح چیخ اُٹھی، میں نے موضوع بدلنے کے لئے پوچھا،
"گڈّی کے پاپا شاید آج نہ آسکے۔ آنے کی اطلاع نہیں دی تھی کیا؟ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں ——"
"ستیش صاحب!" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد وہ بولی، اُکھڑی ہوئی سانس میں، اُس کے چہرے کی اداسی گہری ہو گئی "جو بات آج تک میرے دل میں چھپی رہی، جسے میں بھول چکی تھی، نہ جانے کیوں وہ بات میری زبان پر آ رہی ہے، آپ وہ بات سُنیں گے، تو —— تو ——"
اُس کی زبان لڑکھڑائی، اُس کی آنکھوں میں آنسو آمڈ آئے۔
"آپ مجھے غیر نہ سمجھئے، میں نے کونسی بات آپ سے چھپائی ہے، میں نے"
"لیکن میں —— وہ عجیب وحشت کے عالم میں آگئی" میں آپ کو وہ بات بتاؤں گی، چاہے آپ مجھ سے نفرت کریں یا مجھے دھتکاریں ——
گڈّی کا کوئی پاپا نہیں، وہ ہمارے لئے مر گیا، ایک دن وہ میری زندگی میں آیا،

اور مجھ سے سب کچھ چھین کر لے گیا، میں نادان تھی، اور پھر وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا، کبھی واپس نہ آیا! گڈّی پیدا ہوئی، اور لوگوں نے میرا جینا حرام کر دیا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ میرے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔ لیکن میں آج بھی زندہ ہوں، اور ـــــــ کام کرتی ہوں، اپنے شہر سے دور، میں لوگوں سے چھپتی ہوں، میں گڈّی کے لئے جی رہی ہوں۔ گڈّی کے سوا میرا کوئی نہیں ـــــــ کوئی نہیں ـــــــ ۔۔ کوئی بھی نہیں!"

وہ پاگلوں کی طرح ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی اور منہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

وہ سسک رہی تھی۔

کمرے میں سناٹا تھا، باہر چراغوں کی لَویں کانپ رہی تھیں!

اور میں دھیرے دھیرے حیرت اور صدمے کے گرداب سے اُبھر رہا تھا!

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، مسرت کے آنسو ـــــــ آج کتنے برسوں کے بعد میری بچھڑی ہوئی روپ متی میرے سامنے تھی! ۔ مجھے اچانک میری گمشدہ جنت مل گئی تھی۔

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور متی ـــــــ!

اتنے میں گڈّی دوڑتی ہوئی آئی، اور میں نے اُسے بازوؤں میں اُٹھا کر سینے سے لگا لیا ـــــــ!

اُس نے جلدی جلدی غسل کیا، اور ایک نیا ریشمی سُوٹ پہن لیا، اپنے
گھنے سیاہ بال اس نے دو لمبی چوٹیوں میں گوندھ لئے تھے، وہ قدِ آدم آئینے
کے سامنے آئی ریشمی فراک میں چھپے ہوئے جسم کے نشیب و فراز دیکھ کر اس
کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ آگئی، شرمگیں آنکھیں، چہرے کی آگ
اور رسیلے ہونٹ وہ توجہ سے اپنے خد و خال دیکھنے لگی، وہ واقعی خوبصورت
لگ رہی تھی ——— لیکن آج تک اُسے کبھی یقین نہ آیا کہ وہ خوبصورت
ہو سکتی ہے، وہ آئینہ دیکھ کر کبھی خوش نہ ہوئی، کونسی بات تھی اس کے جسم میں
جو اسے دوسری عورتوں سے مختلف بنا دیتی، ہزاروں بار یہ جملے اس کے کانوں
میں سرسرائے تھے کہ وہ بے انتہا خوبصورت ——— اب یونہی بے کار خیالوں
میں وہ اُلجھی جا رہی ہے، اور اُدھر چار بج چکے ہیں ———

چار بج چکے ہیں،

اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، اب صرف دو گھنٹے رہ گئے

اور وہ ــــــ فخر اور مسرت کے جذبات سے وہ گھبرائی، وہ آئینے سے ہٹ چکی تھی، اور کمرے کی چیزوں کو قرینے سے رکھ رہی تھی، ابھی اُسے بہت سارا کام تھا، وہ آئیں گے تو کیا محسوس کریں گے، ساجدہ آپا نے آج پھر اُس کے مغز کھائے، اُس کا وقت برباد کیا، اُس کا بیٹا کام کا آدمی نہیں تو کسی کا کیا قصور، آج دوسری بار اُسے دکان سے نکالا گیا تھا، بے وقوف! ــ کیا کروں، میری قسمت پھوٹی ہے ــــــ " ساجدہ کہتی رہی "یہ لڑکا کہیں ٹک نہیں سکتا، سوچتی ہوں اس کے بغیر میرا کون ہے، لیکن تقدیر کی لکیروں کو کون مٹا سکتا ہے، جانتی ہیں آپ ہاتھ دیکھنے والوں نے کیا کہا ہے، یہ بچہ بھاگوان ہے، لیکن یہ کہیں قدم نہیں جمائے گا، اور یہ حرف بہ حرف سچ نکل رہا ہے۔"

"تو کیا ہاتھ دیکھنے والوں کی بات سچ ــ"

اُسے سخت افسوس ہوا، یہ الفاظ کیوں اُس کے منہ سے نکلے۔

"اور کیا ــــــ ؟" ساجدہ نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے پانی کو دوپٹے کے پلّو سے صاف کیا، "یہ لوگ انسان کی تقدیر کی لکیریں پڑھ سکتے ہیں، میری لڑکی راجو کی جواں مرگی کی بات مجھے برسوں پہلے ایک سادھو نے بتائی تھی، اور ــــــ "

وہ اتنا ہی سن سکی اور کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر اُٹھی، اُس نے جلدی میں اُس سے وعدہ کیا، کہ آج وہ ضرور اُن سے کہے گی، اور اُس کے لڑکے کو پھر کام پر لگوائے گی۔

اور جب ساجدہ چلی گئی، دعائیں دیتی ہوئی، تو اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

اُس کا بیٹا کام چور ہے، لاپرواہ ہے تو اس میں تقدیر کا کیا قصور ———
وہ سوچنے لگی، پھر وہی خیالوں کا ہجوم اُسے خیالوں میں اُلجھنے کی فرصت کہاں
بچپن سے اُس کی یہ عادت رہ گئی، معمولی سی باتوں پہ پہروں تک سوچنا — !
وہ پھر کام میں لگ گئی، وہ آج صبح ہی سے کام میں جٹی ہوئی تھی، پکن میں نوکروں
کو ہدایات دے رہی تھی. کمروں کی صفائی کرا دی تھی ا اپنے کمرے کو سجا رہی
تھی خود کپڑوں پر استری کر رہی تھی، اور اب ———
وہ کھڑکی کے قریب رکی، سامنے باغ میں پھولوں کی کیاریوں میں تیز
دھوپ پھیل رہی تھی، باغ کے پرے، سڑک کے کنارے اب درختوں
کے سائے پھیل رہے تھے اُسے پھر ساجدہ کا خیال آیا۔ وہ گھبرائی، ساجدہ
کا خاوند پچھلے سال مل میں کام کرتے ہوئے برقی رَو کی زد میں آکر مر گیا تھا
اور اب اُس کا لڑکا اُن کی دکان میں کام کر رہا تھا، وہ ضرور اُسے کام پہ
لگوا لے گی، لیکن اُس سے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے والوں نے کہا ہے کہ وہ کہیں
قدم ——— اُف! پھر وہی خیال! وہی سوچ، وہ تو بھول چکی ہے۔
اِس بات کو، وہ اب اِن درویشوں اور سادھوؤں کی باتوں پہ کوئی یقین
نہیں رکھتی۔ ہاتھ کی لکیریں تقدیر کی لکیریں نہیں۔ جب سے وہ امجد کے گھر
میں آگئی ہے اُس کی تقدیر روشن ہو گئی ہے، اُس کے ارمانوں کے گلاب کھل
اُٹھے ہیں، وہ مسرور ہے، اُس کی زندگی کا ہر لمحہ مسرتوں اور رنگینیوں سے
معمور ہے، امجد نے اپنی ساری کائنات اُس کے قدموں پہ رکھ دی ہے۔
وہ اُس کے گھر کی ہی ملکہ نہیں اُس کے دل کی ملکہ بھی ہے ———
کئی رنگین لمحے سرسرا کر اُس کے خیالوں میں پگھل گئے!
وہ اُس کی جگمگاتی ہوئی دکان میں بیٹھی تھی، امجد نے مسکراتے ہوئے

اُس کا پرس واپس کیا تھا جو وہ گذشتہ ہفتہ وہاں سے کچھ کپڑا خریدنے کے بعد بھول گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اِسی دُکان سے کپڑا خریدتی تھی۔ جب سے وہ امروہہ سے دہلی آئی تھی۔ اور ماجد ہمیشہ اُس سے محبت سے پیش آتا تھا، اور جب وہ شکریہ کر کے رخصت ہونے لگی تو اچانک بارش کا ایک زبردست ریلا آیا، اُس کے قدم رُک گئے۔

"آج آپ کو چائے پی کے ہی جانا پڑے گا، یہ فیصلہ نیلی چھتری والے کا ہے۔"

وہ مُسکرائی اور اُس کے پیچھے پیچھے دُکان کے اندرونی حصّے میں چلی گئی۔

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے ـــــ" چائے کے گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے وہ بہکنے لگا "جب پہلی بار آپ دُکان میں آئیں میرے دل کو کچھ ہو گیا، اور جب بھی آپ آتی ہیں، میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہوں،"

"آپ کی محبت ہے ورنہ ـــــ" الفاظ اُس کے حلق میں پھنس گئے۔

اور وہ ایک قدم آگے آیا۔

"اللہ نے پیسہ کافی دیا ہے، لیکن زندگی ویران ہے، چار برس ہوئے میری گھروالی نمونیہ کا شکار ہوئی، اور اُس وقت سے ـــــ خیر چھوڑیئے آپ کو دیکھ کر ـــــ"

"آپ بڑے آدمی ہیں، مجھ میں ایسی کونسی بات ہے" اُس کے چہرے پر سایہ سا پھیل گیا، "میرا گھر بھی اُجڑ چکا ہے، اور میں بیوہ ـــ" اُس کی آنکھوں میں آنسو تھرتھرائے!

"میں سب کچھ جانتا ہوں، میں آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں، میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن میری بدقسمتی ہے،

کہ آپ نے مجھے اب تک نہ پہچانا ۔۔۔ "

وہ پگھل کر رہ گئی ۔

اور دوسرے مہینے وہ اُس کے گھر آئی، اُس کی دلہن بن کر ۔۔۔!

امجد کے پیار نے اُس کے دل کے زخموں پہ پھاہا رکھا تھا، اُس کی زندگی کے اندھیرے کافور ہو چکے تھے؛ اُس کے جسم کی رنگت روز بروز نکھر رہی تھی ۔ وہ شاید پہلی بار جوانی کے خوابوں میں کھوئی جا رہی تھی ۔ آج اُس کے خوابوں کا شہزادہ! وہ آ رہے ہیں، آٹھ دنوں کے بعد ۔۔۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار بمبئی گئے تھے نیا مال بُک کرانے کے لئے ۔ اور آج وہ آ رہے تھے ۔ اُس نے کلاک کی طرف نظر اُٹھائی ۔

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ۔۔۔!

کلاک نے پانچ بجائے ۔

وہ جلدی سے الماری کی طرف لپکی، اُس نے الماری میں سے ایک نیا بلیو رنگ کا بیڈ شیٹ نکالا ۔ اور پلنگ پر بچھا دیا ۔ کچھ سوچ کر وہ پلنگ پہ لیٹی ۔ اُس کی بوجھل پلکیں جھک گئیں ؛ ایک شرمیلی مسکراہٹ اُس کے عارضوں پر بکھر گئی، قوس قزح بن کر ۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی ۔

"کون ہے؟" "میں ہوں انور"

"آیئے انور صاحب" دروازہ کھلا، سامنے دکان کا خاص سیلزمین اور منشی جی تھے ۔

"ہم اب اسٹیشن جائیں گے، چھ بجے کی گاڑی سے وہ آ رہے ہیں، سوچا آپ کو جانے سے پہلے اطلاع دیدیں "

"آپ فوراً جائیے "

______ وہ چلے گئے۔

"جانتی ہیں آپ ہاتھ دیکھنے والے نے کیا کہا ہے ___" ساجدہ کے الفاظ اُس کے ذہن میں پھر جاگ اُٹھے، خاموشی تھرّائی، اُف! کیوں یہ چڑیل آج ہی اُس کے گھر آگئی، اچانک اُس کے دل کی مسرّت کافور ہو گئی، جو بات وہ دل و دماغ کی نامعلوم گہرائیوں میں دفنا چکی تھی، وہ بات اچانک اُسے یاد آگئی تھی۔

ایک دل ہلا دینے والی آواز کہہ رہی تھی، اور خاموشی میں کئی بھنور پڑ رہے تھے ______ "تمہاری زندگی ایک کالی رات ہے، تم جس سے شادی کرو گی، وہ تم سے بہت دُور چلا جائے گا۔ تمہارا سہاگ اُجڑتا رہے گا۔ تمہاری تقدیر کی لکیروں میں ہمیشہ بیوہ کے آنسو ہیں، یہ میں نہیں تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں، تم سدا ______"

امروہہ میں ایک دن جبکہ اُس کی شادی کی بات ہو رہی تھی، اور وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی تھی، ایک پامسٹ نے کہا تھا، اُس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر، لمبے لمبے بالوں اور وحشی آنکھوں والا پامسٹ، اور پہلا جملہ سنتے ہی اُس کی جان نکل گئی تھی۔ اور پھر وہ پوری بات سننے سے پہلے ہی چیخ مار کر وہاں سے اُٹھ آئی تھی۔

اور جب امروہہ میں اُس کی شادی ہو گئی، ایک اسکول ماسٹر کے ساتھ وہ ہنسی خوشی اُس کے گھر میں رہنے لگی، وہ پامسٹ کے الفاظ بھول چکی تھی، تو ایک دن اُس کا شوہر گھر آیا، وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ بستر پر دراز ہو گیا، اور بیس دنوں کے بعد جب اُس کی لاش وہاں سے اُٹھی تو اچانک پامسٹ کے الفاظ اُس کے ذہن میں گونج اُٹھے۔

اور اُس نے اُسی دن عہد کیا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ تقدیر کو بدلنا انسان کے بس کی بات نہیں، لیکن والد صاحب کے اصرار پر چھ مہینوں کے بعد ہی دبلی آئی، وہ پھر دلہن کا روپ دھار چکی تھی۔ اُس کے نئے خاوند میونسپلٹی میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے، وہ ہمیشہ اُن کا خیال رکھتی، اُس کا بس چلے تو وہ اُنہیں دل کے حسین پردوں میں چھپا لے، وہ اُن کے سائے کی بلائیں لیتی تھی۔ وہ اُن کے قدموں پر آنکھیں بچھاتی، اور جب تک وہ آفس سے واپس نہ آتے، وہ فکر مند رہتی۔ اب وہی اُس کی کل کائنات تھے۔ اُس نے چھ مہینے جو بیوگی میں گذارے تھے اور اُس پر جو کچھ گذری تھی، وہی جانتی تھی، عورتوں کے طعنے ——— یہ ڈائن ہے، ڈائن، سال بھر ہی میں بیچارے ماسٹر صاحب کو کھا گئی، اس کا سایہ منحوس ہے، یہ چڑیل ہے، اور وہ ان زہر بھرے نشتروں کو خاموشی سے پی جاتی، اور جب اُس نے دیکھا کہ وہ ماں باپ کے کندھوں پر بھی بوجھ بن گئی ہے، تو اُس نے دوسری شادی کی حامی بھر لی اور اب ——— ! وہ اپنے چہیتے خاوند پر مرمٹتی، اور ایک بار پھر وہ زہریلے الفاظ بھول چکی تھی۔ لیکن اُن دنوں جبکہ شہر میں کالرا پھیل چکا تھا، دہشت اور خوف کا عالم تھا، اور وہ گھبرائی ہوئی اُن کے آنے کی منتظر تھی تو اُسے میونسپلٹی کے چپراسی نے اطلاع دی کہ وہ ایڈمٹ کئے گئے ہیں، اُن پر کالرا کا حملہ ہوا تھا۔

وہ اندھی ہو کر ہسپتال کی طرف دوڑی، اور وہاں وہ موت کی نیند سو رہے تھے، پامسٹ کے الفاظ اُس وقت بھی سارے ہسپتال میں گونج اُٹھے تھے۔ اُس کی دُنیا پر کالی رات چھا گئی تھی ———

"میں نے کہا جی" اچانک نوکر کی آواز آئی۔

"کیا ہے؟" شکر ہے نوکر نے اُسے چونکا دیا، کیوں یہ خیال اُس کا تعاقب کرتے ہیں، بے کار خیال، اُسے کیا ہو گیا ہے، اچانک وہ ہتھیلی کو گھورنے لگی، اُلجھی اُلجھی لکیریں۔ وہ لکیروں کے بھنور میں ڈوبنے لگی۔

"ترکاریاں سب تیار ہیں، میں نے کہا چاول بھی پکانے ہیں؟"

"اُنہیں تو چاول پسند نہیں، پھر بھی پکا لو تھوڑے سے، کیا حرج ہے۔"

وہ بھنور سے نکل گئی۔

"اچھا جی۔"

"چلو میں بھی آتی ہوں۔"

کچن میں اُس نے ساری پکی ہوئی چیزوں کو دیکھ لیا۔ اُسے زندگی کی حقیقت کا پھر سے احساس ہوا۔ ماضی دھندلکوں میں تحلیل ہو ا ہے۔ دھندلکے کچھ بھی نہیں، اور حال ایک حقیقت ہے۔ وہ جی رہی ہے، اُس کا گھر آباد ہے، وہ دولت میں کھیل رہی ہے۔ اور امجد کا پیار ——— اُسے اور کیا چاہیئے ———؟

اُس کی سُرمگیں آنکھوں میں شراب کا نشہ اتر آیا۔

وہ اُٹھی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔

ہر چیز اپنے ڈھنگ سے تھی، قرینے سے تھی، وہ آ جائیں گے تو خوش ہو جائیں گے، وہ دروازے پر آتے ہی اُسے پکاریں گے، اُسے سینے سے لگائیں گے، زور سے کتنا پیار کرتے ہیں وہ اُس سے، کیا مرد اتنا پیار بھی کر سکتے ہیں؟ اور یہ آٹھ دن اُنھوں نے کس بے چینی میں، گذارے ہوں گے، بالکل وہی حالت ہو گی اُنکی، جو میری رہی ———

ٹن ـــــــ!

ساڑھے پانچ بج گئے۔ اور اب وہ آدھ گھنٹے میں دہلی اسٹیشن پر ہوں گے۔ سٹیشن پر دکان کے آدمی اُن کا استقبال کریں گے، اور پھر وہ سیدھے گھر ـــــــــــ

اُس کے دل کی بے چینی بڑھنے لگی، یہ تیس منٹ جلدی سے گذر جاتے! اُف! ایک ایک منٹ سَو سَو سال کے برابر ہو رہا ہے ـــــــ!

اچانک اُس کا دل ڈوبنے لگا ـــ کیا ہو گیا اُسے؟ وہ آ ہی تو رہے ہیں، وہ خدا کے فضل سے اچھے ہو گئے۔ خواہ مخواہ وہ پریشان ہو رہی ہے ــــــ

وہ پلنگ کر بیٹھیں کی طرف آئی اور ڈرائیر سے اُس نے پیڈ نکالا، وہاں امجد کے آٹھ دس خطوط تھے، جو اُنہوں نے ان آٹھ دنوں میں لکھے تھے شکر ہے وہ اچھے ہیں۔ اور یہ رہا آج کا تار (Reaching by Eoering Frain)

اُسے کچھ اطمینان سا ملا اور وہ خطوں کو اُلٹنے پلٹنے لگی۔

چھ بجنے میں اب صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔

اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بے چینی میں ریڈیو کے پاس آئی۔ اُس نے ریڈیو کی سوئی گھمائی، لیکن شام کی مجلس بھی چھ بجے شروع ہو گی۔ اُف، یہ چند منٹ، دیوار پر لگے ہوئے امجد کے فوٹو پر اُس کی نظر اُٹھی اُن کے موٹے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ جیسے اُنہوں نے اُس کی چوری پکڑی تھی، اُس کی بے چینی، وہ آج اُسے خوب چڑائیں گے۔

اور ـــــــــ

وہ پھر کھڑکی کے پاس آئی۔

درختوں کے سائے دراز تر ہو چکے تھے۔

ہوا میں قدرے خنکی آگئی تھی ۔
وہ بل کھاتے ہوئے راستے میں کھو گئی ۔
ٹن ٹن ٹن . . . .
کلاک نے چھ بجائے ۔
اُس کا دل دھڑک کر رہ گیا ! ـــــ وہ ٹرین کے دروازے پہ کھڑے مسکرا رہے ہیں ، ٹرین رُکی ، وہ پلیٹ فارم پہ اُترے ، انور صاحب اور منشی جی سے اُنہوں نے ہاتھ ملایا ، پلیٹ فارم سے باہر آکر وہ ٹیکسی میں بیٹھے چاندنی چوک ، دریا گنج ، کشمیری گیٹ ، لمبی سڑک ، ـــــ خوب ، ٹیکسی لب سڑک پر فرّاٹے بھر رہی ہے ، اور ؟ اور اب ـــــ ؟
وہ بڑی بے قراری کے ساتھ راستہ تک رہی تھی ،
راستہ تکتے تکتے وہ تھک گئی ، اُس کی آنکھیں تھک گئیں ۔
لیکن وہ ابھی تک نہ آئے ، وہ کیوں نہیں آئے ، کیا وہ پہلے دکان پہ گئے ؟ نہیں ، ایسا نہیں ہو سکتا ، وہ پہلے ـــــ لیکن خدانخواستہ وہ ـــــ اُف ! وہ سر تھام کر رہ گئی ۔ اگر ایسا ہو گیا تو ـــــ تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی ، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ، لیکن وہ ایسا کیوں سوچتی ہے ؟ وہ پاگل ـــــ
ٹن ٹن ٹن . . . . . .
کلاک نے سات بجائے ۔
کمرے پہ مہیب سناٹا چھا گیا !
اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ، وہ اُٹھی اور اُس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اُٹھایا ۔

"ہیلو —— جی —— جی ہاں، انور صاحب، آپ گھبرائیے —— بونٹنگ ٹرین اکسیڈنٹ، ٹرین —— پانچ سو آدمی مر گئے ہیں،

—— ہائے اللہ!!"

وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

چند تاریک لمحے گذرے۔

تمہاری زندگی ایک کالی رات ہے۔ تم جس سے شادی کروگی، وہ تم سے دور چلا جائے گا۔ تمہارا سہاگ اجڑ تا رہے گا۔ تمہاری تقدیر کی لکیروں میں ہمیشہ جیون کے آنسو ہیں۔ یہ میں نہیں تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں —— "

—— اُس کے ہاتھ کی لکیریں چیخ رہی تھیں!!

"نہیں، نہیں، اب ایسا نہیں ہوگا —— اب ایسا نہیں ہوگا" وہ وحشت اور دیوانگی کے عالم میں اٹھی، اُس کا لرزتا ہوا جسم پسینے پسینے ہوگیا تھا۔

اُس کی آنکھوں کی روشنی چھن گئی تھی، وہ لڑکھڑاتے ہوئے دل پلنگ کی طرف لپکی، لیکن دیوار کے ساتھ ٹکرا کر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔

خاموشی گہری ہوگئی!

کلاک نے نو بجائے اور دروازہ کھلا۔

"کہاں ہو تم زرینہ —— میں آگیا ہوں، جنتا سے آگیا، کچھ لیٹ پہنچا ہوں، زرینہ —— نوکر —— کہاں سب مر گئے ہیں؟"

اور جب اُس نے کمرے میں سوئچ آن کیا تو اُس نے دیکھا زرینہ فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں اُس کے چہرے پر جھک گیا، اور اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔

———— = ————

اچھا ہوا آجی کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر یہاں بیٹھی رہوں گی اطمینان سے
کتنی ٹھنڈی ہی جگہ ہے۔ نل سے گرتا ہوا ٹھنڈا پانی۔ یہ سیمنٹ کا بنا ہوا حوض اور
لکڑی کی یہ دیواریں اور چھت۔ جی چاہتا ہے دن بھر یہیں پڑی رہوں سیمنٹ
کے اس ٹھنڈے فرش پہ لیٹی رہوں۔ یہ ٹھنڈی اور پرسکون جگہ۔ ٹھنڈی ہوا
نے جلوے تک۔ خاموشی۔ باہر تو دھوپ نہیں، آگ برس رہی ہے۔ شیلا کا کتا
جو کسی ہمسایہ عورت کو پانی لینے کے لئے اندر نہیں جانے دیتا، اس وقت
زبان باہر نکالے دیوار کے سائے میں ہانپ رہا ہے۔ بڑا خوفناک کتا ہے
لیکن میں آتی ہوں تو دور ہی سے دم ہلاتا ہے۔ ارے نل میں پانی بہت کم ہو
گیا ہے۔ سنتا ہے نل میں پانی کم ہی آتا ہے گرمیوں کے موسم میں۔ کہاں سے
آتا ہے یہ پانی؟ دریاؤں سے۔ ہشت! دریاؤں کا پانی گندہ ہوتا ہے۔ شیلا
جب اسکول جانے لگی تھی تو کہتی تھی کہ پانی پہاڑوں سے آتا ہے۔ برف پگھلتی

ہے۔ پانی جمع کیا جاتا ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا، اور . . . . اب تو پانی پتلی سی دھار میں بہہ رہا ہے، جیسے چاندی کا تار، اور یہ آواز! عجیب سی آواز نکلتی ہے گھڑے سے۔ جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ سنتے سنتے نیند سی آنے لگتی ہے۔ نہ جانے کتنی دیر میں گھڑا بھر جائے گا۔ امی ڈانٹ تو نہیں دیں گی۔ وہ پاؤں پسارے سو رہی ہیں اور میں نے پہلے ہی گھر کا سارا کام کر لیا ہے۔ برتن دھو لئے ہیں۔ چاول صاف کر لئے ہیں، آلو کاٹ لئے ہیں۔ جھاڑو لگا دی ہے۔ اور اب پانی کے گھڑے بھر رہی ہوں۔ کیا مصیبت ہے جسم تھک کر چور ہو گیا ہے۔ دیکھو میرے سر میں بھاری پن ہے۔ ٹانگیں اور بازو بھی اکڑ گئے ہیں۔ سارا جسم درد کر رہا ہے۔ ورنہ تم یہ کام کئے جاؤ۔ کیوں؟ تم کنواری ہو۔ کنواری لڑکیوں کا کام ہی یہ ہے۔ کام پہ کام کئے جاؤ اور تھکاوٹ کا نام نہ لو۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام ———— رسوئی گھر نہ ہوا قید خانہ ہوا۔ جہاں تاریکی اور گھٹن ہے۔ اور مجرموں کی طرح سخت کام۔ آخر میں نے کیا جرم کیا ہے۔ امی کہتی ہیں، شریف لڑکیوں کے یہی چلن ہوتے ہیں۔ لڑکی پرایا مال ہے، اپنے گھر جاتا ہے اور وہاں عمر گزارنی ہے۔ شوہر دیوتا ہے۔ اس کی خدمت کرو۔ گھر کے دوسرے لوگوں کی خدمت کرو۔ خدمت، خدمت، خدمت۔ اف! جیسے لڑکیاں صرف مردوں کی خدمت کرنے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ اور مرد؟ کتنا غصہ آتا ہے مجھے امی کی یہ باتیں سن کر۔ بیہودگی اور بے سر و پا باتیں۔ کئی بار جی میں آیا کہہ دوں، یہ جھوٹ ہے! بتاؤ شبو لڑکی نہیں۔ وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ کیوں نہیں لگاتی۔ کیا اسے پرائے گھر نہیں جانا ہے! کالج سے آتی ہے ایک میم کی طرح، اور سیدھی اپنے کمرے میں جا کر اپنے بستر پہ لیٹ جاتی ہے

اُس کی اُمی چائے لے آتی ہیں۔ رسوئی میں وہ بھول کر بھی قدم نہیں رکھتی کبھی گھڑے کو ہاتھ نہیں لگاتی اور سب گھر والے اُس سے خوش ہیں، اُس سے ڈرتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ اُس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ بولو! جواب کیوں نہیں دیتیں؟ اب خاموش ہو گئیں. . . . . ارے کیسی باتیں سوچتی ہوں میں؟ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں شیلا کی کیا برابری کر سکتی ہوں! وہ ٹھہری امیر باپ کی لڑکی! اور تعلیم یافتہ۔ اور میں؟ . . . . . اچھا چھوڑو اس بات کو۔ باپ کا گھر تو آسے بھی جانا ہے۔ تعجب ہے۔ ایک عمر تک جس گھر میں رہے اُسے چھوڑ دو، ہمیشہ کے لئے اور شوہر کے گھر رہو۔ اور اگر شوہر عجیب سا آدمی ہو، جیسا روپا کا شوہر ہے۔ عجیب سی شکل و صورت کا، دانت باہر کو نکلے ہوئے اور چھوٹی سی ناک ایک جانور ہے وہ! مجھے تو اُسے دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ اور کیا شوہر ایسا ہو تو اُس کے آگے بھی سر کو جھکانا چاہئیے؟ اور وہ تمہارے ساتھ رہے۔ تمہارا مالک ہے وہ، تمہارا شوہر تمہاری آتما کا مالک اور تمہارے جسم کا مالک جسم کا مالک اور . . . . کتنی عجیب بات ہے۔ بے ہودہ خیال! کیسے گوارا کرتی ہے روپا اس گدھے کو۔ میں تو کبھی ایسے انسان کے ساتھ. . . لیکن اگر میری شادی ایسے ہی کسی مرد سے ہوئی۔ اُف! میں تو زہر کھالوں گی۔ لیکن شادی تو کرنی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ یہ خیال آتے ہی کیوں سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ دیکھو، میرا دل دھڑکنے لگا ہے۔ رگوں میں آگ سی دوڑ رہی ہے آخر کون سی بات ہے شادی میں؟ سب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے۔ اور، لیکن یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا اور وہ روپا کی

بچی کہہ رہی تھی کہ تمہیں کوئی غیر آدمی دیکھے تو یقین نہ کرے کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم تو پوری عورت سی لگتی ہو۔ بے شرم! میں عورت ہوئی اور وہ ابھی دودھ پیتی بچی ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے بے چاری۔ بھگوان کی دیا ہے میری صحت اچھی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں مضبوط ہیں۔ اور میرا جسم اُس کی طرح ہڈیوں کا پنجر نہیں۔ کہتی تھی تمہارا جسم ہی ایسا ہے کہ مرد اپنی جان دے دے۔ ظالم کیسی باتیں کرتی ہے۔ کوئی سُن لے تو؟ شادی سے پہلے تو وہ اتنی بے حیا نہ تھی۔ شادی کے بعد کیا ہو جاتا ہے؟ ویسے کا پانی مر جاتا ہے بدل جاتا ہے انسان۔ کملا اور دلاری بھی بدل گئیں۔ کیا میں بھی بدل جاؤں گی؟ نہیں، لیکن میری شادی؟ ہائے میرے بھاگ ہی کھوٹے ہیں۔ ورنہ آج سے تین سال پہلے میں بھی سہاگن بن گئی ہوتی۔ خود بخود پیار آگیا مجھے اپنے اَن دیکھے شوہر پر۔ بلکہ امتحان پاس کر کے وہ ایک افسر بن گیا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا؟ ناتھ جی میں اب بھی اس کا نام بھولتی نہیں۔ حالانکہ مجھے اِس نام سے چڑ ہے۔ بے ڈھنگا سا نام۔ آجکل کون ایسا نام رکھتا ہے۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے؟ اور بات پکی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ آن ہی دنوں پتا جی۔ ہائے ایک بجلی گر پڑی ہم پر۔ اور ہمارا سب کچھ جل گیا۔ ہم بے سہارا ہو گئے۔ کون ہے اب ہمارا اندر سے ہماری حالت کیا ہے؟ کسی کو کیا معلوم۔ سچ کہتی ہیں ماں، آنکھوں میں آنسو بھر کے، کوئی ساتھ نہیں دیتا مصیبت میں۔ اور جب پتا جی کے سورگ باش ہونے کی خبر ناتھ کے کانوں میں پہنچی تو وہ کیا بدل گیا۔ بہانہ بنایا کہ میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ ہنھ! اور پھر راگھو جی کے ہاں بات شروع ہوئی۔ آن کا بڑا لڑکا اسکول میں ماسٹر ہے۔ سنا ہے خوب صورت ہے۔ لیکن وہ اُس وقت شادی

کرنے پر تیار ہوں گے جب ہم دو ہزار کی رقم ادا کر دیں۔ تاکہ وہ ادھوری
تعلیم مکمل کرے۔ نتیجہ، شادی نہ ہوئی سودا بازی ہو گئی۔ اس رات کو میں
کتنی روئی۔ جب صبح کو میری نظر آئینے پر پڑی تو میری آنکھیں سوجی ہوئی
تھیں، اور جب پچھلے سال پنڈت جی نے کہا کہ ہر جگہ یہی پوچھتے ہیں، لڑکی
پڑھی لکھی ہے؟ اور ہر جگہ وہ لاجواب ہو جاتے ہیں۔ تو میں کلیجہ تھام
کے رہ گئی۔ اور اس نگوڑی شیلا نے روبیا سے کہا تھا، کون پوچھے گا ایسی
لڑکی کو جو دو حرف بھی نہ پڑھ سکے۔ اَن پڑھ! اَن پڑھ اور اندھے میں
کوئی فرق نہیں تو میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ بات سچی تھی لیکن کیا
حق تھا شیلا کو یہ کہنے کا! بڑی آئی کالج والی۔ مان لیا وہ کالج جاتی ہے،
اور انگریزی فر فر پڑھتی ہے۔ لیکن وہ میرے لئے ایسی باتیں کیوں کرے۔
کتنی بدل گئی ہے وہ بچپن میں تو میرے ساتھ کھیلی ہے۔ ہمارے گھر سے
قدم باہر نہ رکھتی تھی۔ وہ اسکول کیا گئی، بس بالکل ہی بدل گئی۔ یہ موئی
تعلیم بھی کتنی بری چیز ہے۔ کہتے ہیں تعلیم روشنی دیتی ہے۔ عقل بڑھاتی
ہے اور ...... لیکن شیلا کتنی مغرور ہو گئی ہے۔ میں گھڑا لئے
صحن سے گزرتی ہوں، وہ کتابیں لئے کالج جاتی ہے۔ مجھ سے بات بھی نہیں
کرتی۔ بات کرنا تو در کنار نہ دیکھتی بھی نہیں میری طرف! نہ جانے کیا ہو گیا
اسے؟ ..... کاش، ہم غریب نہ ہوتے۔ ہمارے صحن میں بھی نل لگ
جاتا۔ اور پھر میں بھول کر بھی شیلا کے صحن میں نہ آتی، کیا سمجھتی ہے یہ اپنے
آپ کو؟ ..... گھڑا اب آدھے سے زیادہ بھر گیا ہے۔ پانی کی دھار
بھی تیز ہو رہی ہے۔ یہ گھڑا بھی لے جاؤں گی اور بس، اور پھر نہاؤں گی،
لیکن کیا ہوتا ہے نہانے سے، جتنی دیر ٹھنڈا پانی جسم پر ڈالتے جاؤ گرمی کا

احساس نہیں ہوتا۔ اور کپڑے پہن لئے تو پھر وہی گرمی، وہی آگ۔ سب
کہتے ہیں کہ نہانے سے بدن میں ٹھنڈک آجاتی ہے۔ لیکن میرے بدن کو
تو اور زیادہ گرمی لگتی ہے۔ روپا کہتی ہے کہ جب تم نہا کر نکلتی ہو تو ایک
بجلی بن جاتی ہو۔ نہ جانے کس کس کو جلا کر خاک کر دو گی۔ وہ تو مجھے ہر وقت
بناتی ہے۔ باتونی۔ اس سے بحث کون کرے۔ شیلا اتنی پڑھ لکھ کر بھی
اس سے بات نہیں کر سکتی۔ شاید سچ ہی کہتی ہے روپا۔ کل بھی جب میں
نے نہانے کے لئے کپڑے اتارے، کھڑکی کی دیوار کی درزوں سے
آتی ہوئی دھوپ کی روشنی ساری کوٹھری میں پھیلی تھی۔ خوب پانی ڈالا
میں نے جسم پر۔ تو ایک بار میں نے سارے جسم کو دیکھا۔ کتنی شرمائی تھی میں،
لیکن سچ مچ چمک رہا تھا میرا جسم آئینے کی طرح۔ اب کس سے کہوں یہ بات
میری اپنی نظر مجھے دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ تو سب کہتے ہیں کہ میں شیلا سے
زیادہ خوبصورت ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میں یہ زین نکال کر شیلا کی
طرح ریشمی فراک اور ساٹن کی شلوار پہنوں اور بالوں میں سینٹ لگا کر نیلے
رنگ کی ساڑی پہنوں، پاؤں میں سفید سینڈل پہنوں تو میں . . .
میں، لیکن مجھے ایسے کپڑے پہننے کہاں نصیب ہیں۔ جب پتاجی زندہ تھے
تو کبھی جوانی کے میلے پر فراک پہن لیا تھا۔ اور ساڑی . . . تب تو
میں بچی تھی۔ اور اب، اب تو میں جوان ہوں۔ جوانی بھی ایک مصیبت ہے
اپنی حفاظت کرنا ہو۔ صاف کپڑے نہ پہنو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ہاں شادی
کے بعد تو الگ بات ہے۔ لیکن کب ہو گی میری شادی کب ہو گی ۔۔۔؟
بھوشن اب کالج سے آ رہا ہو گا۔ جب بھی شادی کی بات سوچتی ہوں تو مجھے
بھوشن کا خیال آجاتا ہے۔ کتنا سجیلا لڑکا ہے۔ اب چار بج رہے ہیں۔ وہ

آتا ہوگا۔ ہماری گلی سے گزرتا ہے۔ اور دو رہی سے دھوبی کی کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ کانپ ہی تو جاتی ہوں میں دو تین مہینے پہلے جب اُس نے پہلی بار میری طرف دیکھا اور مسکرایا تو مجھے کتنا غصہ آیا۔ اُس کو میں کچا چبا ڈالتی اُس وقت! لیکن پیارا لڑکا ہے وہ تو۔ اب تو روز مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ اور میں شرم سے دوہری ہو جاتی ہوں۔ کوئی دیکھ لے تو!

شیلا کو تو ان باتوں کی پروا نہیں۔ وہ بڑے بڑے لڑکوں کے ساتھ بیٹھی رہتی ہے شام تک کرتے ہیں۔ باتیں قہقہے، چھیڑ چھاڑ۔ اِس کو معلوم نہیں کرشن کے ساتھ اُس نے کیا گل کھلائے ہیں۔ یہ تو گھر کا حال ہے۔ باہر والی تو بھگوان ہی جانے۔ سنا ہے یہ لڑکیاں کا بج جا کر کسی نہ کسی لڑکے کو پھنستی ہیں۔ جیسے لڑکا نہیں پھول ایسا، اپنے کانوں کے آویزے چُن لیے۔ اور لڑکے بھی روز خط لکھتے ہیں۔ تحفے بھیجتے ہیں۔ ایک دوسرے کو۔ اور پھر عدالت میں جا کر شادی کر لیتے ہیں۔ غلط بھی کیا ہے؟ ابھی پچھلے ہفتہ مادھو کول کی لڑکی نے عدالت میں جا کر شادی کر لی۔ اور بھی کتنی لڑکیوں نے . . . . اب کس کس کا نام یاد رہے؟ لیکن وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ ماں باپ راضی نہیں ہوتے پھر تو اچھا ہی کرتے ہیں)۔ یہ ماں باپ تو بوجھ بن جاتے ہیں۔ بات بات پہ ٹوکنا، ڈانٹنا، کوسنے دینا۔ اور پھر یہ کرو، وہ کرو۔ اور اپنی مرضی سے کچھ نہ کرو۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے گھر کے سامان کو آگ لگا دی جائے۔ بس بیٹھے رہیں۔ اور بیٹھے بیٹھے سپنے دیکھیں۔ ارے میں کیوں ایسا سوچتی ہوں! مجھے بھی سوچنے کا حق ہے میں بھی انسان ہوں اور اگر بھوشن لال . . . . . . کیا بھوشن واقعی مجھے

چاہتا ہے؟ لیکن وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ زبان سے کچھ کہتا نہیں۔
جیسے اُس کے منھ میں زبان ہی نہیں ہے۔ میں تو ایک دو بار دُور ہی سے
اُس کی جھلک دیکھ کر دوڑتی ہوئی نیچے آئی اور صحن کے دروازے پر برتن
ہاتھ میں لئے کھڑی رہی۔ وہ رُک تو گیا لیکن کچھ سوچ کر سیدھا چلا گیا۔
بے وقوف! کل جب کندھے پر گھڑا لے کر گزری تو وہ میرے قریب سے
گزرا۔ اور اُس نے سرگوشی کی۔ "رکمنی! کب تک تڑپاؤ گی مجھے؟" اور میں ڈرا
سہم کر دوڑی اور رسوئی میں ہانپنے لگی۔ شکر ہے بھگوان کا۔ گھڑا ٹوٹنے سے
بچ گیا۔ امّی کو کیا جواب دیتی۔ کتنے پیار سے اُس نے میرا نام لیا "رکمنی!"
میری رگ رگ میں مٹھاس اُتر گئی۔ اور رات تک نیند نہ آئی مجھے۔
کیا کیا سوچتی رہی میں۔ اگر کوئی چپکے سے میرے دل کے اندر جھانکے
تو؟ اور وہ آج آئے گا تو میں ضرور اُس سے بات کروں گی۔ یہ کیا کہ میں
اُس کی بات کا جواب نہ دوں۔ آخر وہ کیا سمجھے گا۔ گونگی ہے۔ جینت!
میں کیوں گونگی ہونے لگی۔ اُس کے ساتھ میری شادی ہو جائے تو وہ بھی
سمجھے گا کہ کس کے ساتھ شادی ہوئی ہے ...... ارے، گھڑا تو کب
کا بھر چکا ہے۔ پانی اُس کے کنارے سے چھلک رہا ہے۔ اچھا ہوا کوئی
عورت پانی لینے نہیں آئی۔ ضرور کہتی میں سو گئی ہوں۔ میں جلدی سے
یہ گھڑا لے جاؤں گی اور گھر پہنچ کر میں خوب نہاؤں گی اور بھوشن ....
وہ کندھے پر گھڑا رکھ کر شیلا کے صحن سے نکلی۔ سامنے گلی تھی۔ تنگ و تاریک
گلی۔ گلی کی دائیں جانب اُس کا گھر تھا۔ اور بائیں جانب گلی آگے کو جاتی
تھی۔ کچھ دور وہ ایک اور گلی سے ملتی تھی اور پھر چند اور گلیوں سے گزر کر
بڑی سڑک آتی تھی۔ بھوشن کا گھر اُس کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔

محلّہ ایک ہی تھا۔ لیکن وہ آسی کی گلی سے گزرتا۔ حالانکہ بیچ کی گلی سے اُس کے گھر کا فاصلہ کم پڑتا تھا۔ . . . . گلی میں آتے ہی اُس کے قدم رُک گئے۔ بے چینی سے اُس نے گھڑے کو ہاتھ سے سنبھال کر سر کو ذرا اوپر اُٹھایا اور وہ چکرا سی گئی اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے دیوار کے قریب، ہوشن شانت کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کر رہا تھا۔ اور آسے کوئی پرچہ دے رہا تھا۔ وہ دونوں اچانک چونکے اور گھبرا کر چل دیئے اور جیسے رکمنی رسوئی میں آگئی، وہ کانپتی ہوئی بچتے کی دیوار کے ساتھ ٹکرائی۔ گھڑا اُس کے کندھے سے گر گیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ بُت کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ . . . . . دوسرے لمحے وہ جلدی جلدی ٹوٹے گھڑے کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔ ▲

وہ کمرے میں آئی۔ تھکی تھکی سی، خاموش، اداس۔

"نہ جانے آج کس طرف نکل گئے ہیں وہ۔ اور کب واپس آئیں گے، ان نظاروں کو پی جانا چاہتا ہوں رضیہ! جب سے آئے ہیں یہاں بس یہی کہتے ہیں، نہ کھانے پینے کا خیال، نہ گھر کی فکر اور نہ بیوی کی پروا! خاک پروا کریں گے نہ، آرٹسٹ جو ٹھہرے! اُنھو، یہ بھی کیا ہوا کہ انسان بس اپنے خیالوں کا ہو کر رہے۔ اور، اور" اُس نے ہونٹ چبا لئے۔

کمرے پر چھائی ہوئی اداسی سے گھبراہٹ محسوس کر کے وہ کھڑکی کے قریب آئی۔ باہر دور دور تک پہاڑوں کی ڈھلوان پر چیل اور صنوبر کے درخت خزاں کی دھند میں گھرے ہوئے تھے۔ خاموش اور سوگوار۔ دن ڈھلے ہی یہ پہاڑی علاقہ اور اس کے دامن میں پھیلی ہوئی چھوٹی سی وادی دھند کے دبیز نقرئی پردوں میں چھپ جاتی۔

آج اُس کے خیالوں پر بھی دھند چھائی تھی۔

نئی آستانی میمونہ کی کہانی کتنی دلگداز تھی! وہ پہلے ہی دن سمجھ گئی تھی کہ یہ عورت دلچسپ شخصیت کی مالک ہے۔ اُس کی اُداس تنہائیوں میں اُسے ایک گم شدہ کہانی کی حسین پرچھائیاں نظر آگئی تھیں۔ اور آج وہ پرچھائیاں ذہن میں سنبھال کر لائی تھی۔ اپنے پیارے شوہر کیلئے۔ اپنے محبوب کہانی کار کے لئے!!

لیکن ڈیرے پر پہنچکر ہی اُس کا موڈ بگڑ گیا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر نکلے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے!

لیکن یہ پرچھائیاں! وہ اِنھیں ذہن سے کیوں نہیں نکال پھینکتی؟ وہ آج اُن کا انتظار بھی نہیں کرے گی۔ انتظار؟ وہ خواہ مخواہ اپنے جگر کا لہو جلاتی ہے اُنہوں نے کب اِس کا انتظار کیا ہے۔ بس قریب آئے۔ پیار کے دو بول بولے۔ اور وہ پگھل کررہ گئی۔ موم کی گڑیا۔

وہ کھڑکی سے ہٹی اور سامنے ٹیبل پر ناول اُٹھانے لگی۔ معاً اُس کی نظر آج کی ڈاک پر پڑی۔

وہ ڈاک دیکھنے لگی۔

ایک رنگین لفافے پر اُس کی نظریں جم گئیں۔

میرے فنکار!

آج دو سال کے بعد پھر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کی تازہ کہانی میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ میں بے اختیار کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اور میرا عہد ٹوٹ گیا۔ تعجب ہے آپ کہاں اِتنی دُور سے میری خلوتوں میں در آئے اور میرے دل کی اُداس دھڑکنوں کو سمیٹ کر لے گئے۔ میں جانتی ہوں میرا یہ خط آپ کی مسرتوں میں خلل انداز نہ ہوگا۔

ہاں اگر آپ خاموش رہے تو آپ کی ایک خاموش مداح کا دل ٹوٹ جائے گا۔ دو سال پہلے ——— آپ کی ——— زرینہ ———

"اُف!!"

اُس پر ایک بجلی گر پڑی۔

وہ آگے نہ پڑھ سکی اور خط ٹیبل پر گر گیا۔ جہاں ڈاک سے آئے ہوئے دوسرے رسالے بھی تھے۔ وہ عجیب سا ذہنی خلفشار لئے سامنے دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اس کے ماتھے پہ پسینے آ رہے تھے۔ اس کے بدن پر رعشہ سا طاری تھا۔

وہ سامنے ہوتے تو وہ آج ہی اس بات کا فیصلہ کر کے رہتی۔ آج کئی دنوں سے اس کے دل پہ جو بوجھ ہے وہ دور جھٹک دیتی۔ اور اطمینان کا سانس لیتی۔ وہ اس بوجھ تلے دب رہی ہے، کراہ رہی ہے۔ اور وہ اپنی ہی دھن میں مست ہیں، سرشار ہیں۔ دیکھو رضو! آج ایک نیا پلاٹ مل گیا۔ ایک دم نیا۔ اور چونکا دینے والا۔ تم نے گرما گرم چائے بنا دی، ادھر میری کہانی مکمل۔ اور وہ ٹیبل پر جھک کر کہانی لکھنے میں لگ جاتے۔ اپنے وجود سے بے خبر، نہ تن بدن کا ہوش ہے نہ گرد و پیش کی خبر۔ جسم پسینے پسینے ہو رہا ہے اور آپ مغول کے صفحے سیاہ کرتے جا رہے ہیں۔ اُن کی یہی ادا تو اسے جان سے پیاری ہے۔ وہ شادی سے پہلے اکثر سوچا کرتی۔ ادیبوں کے بارے میں اور اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں، اس نے اپنی سہیلیوں سے سن تھا کہ ادیبوں پر افلاک سے خیالوں کی بارش ہوتی ہے۔ وہ بلندیوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ اُن کے خوابوں میں بے داغ برفیلی چوٹیوں کا کنوارا پن اور تقدس ہے۔ اور پھر اس کے کنوارے خوابوں کا شہزادہ اُسے مل گیا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ ایک مشہور کہانی کار سے اُس کی شادی ہو گئی۔

آف! یہ کیسا لمحہ اُس کے قریب سے سرسرا کر گزر گیا۔ بے کیف لمحہ، بخ بستہ، دھند میں کھویا ہوا۔ ان دو۔ ڈھائی برسوں میں آج پہلی بار شادی کے خیال نے اُس کے دل میں گدگدی پیدا نہ کی ــــــ نہ جانے کیوں؟

لیکن وہ اُن سے پیار کرتی ہے۔ اُس کے جسم کا انگ انگ پیار کی لطافت اور نشے سے سرشار ہے۔ اُس کا دل دھڑکتا ہے تو بس اُن کے لئے۔ وہ سانس لے رہی ہے تو بس اُن کی پرستش کے لئے۔ وہ اپنی تقدیر پہ نازاں ہے اُسے ایسا محبوب شوہر ملا ہے جس کی والہانہ محبت سے وہ گھبرا اٹھتی ہے۔

اور جب وہ اُن کے گھر آئی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ کتنے مقبول ہیں لوگوں میں، اُن کی مقبولیت دیکھ کر وہ فخر اور مسرت سے پھول جاتی۔ اُن کے مداحوں کے خطوں کا انبار لگ جاتا۔ لوگ اُن سے ملنے آتے۔ محبت اور عقیدت کا بے پناہ جذبہ لے کر۔ اور اُس کے دل کی جبیں جھک جھک جاتی۔

لیکن وہ دن ــــــ؟

وہ اسکول سے تین ہی بجے گھر آئی اور وہاں وہ پہلے ہی دفتر سے آئے ہوئے تھے۔ وہ اندر گئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اندر وہ بیٹھے تھے اور اُن کے پاس ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پتلے سے جسم پہ بہت زیادہ چست فراک پہنے ہوئے تنگ پائنچے والی شلوار۔ سیاہ نائیلون کی ساڑی شانوں پر جھلملاتی ہوئی۔ بالکل بے تکلفی کے ساتھ بیٹھی تھی وہ!

لیکن یہ ہے کون؟

"ارے رضیہ! تم آ گئیں، خوب ــــــ!"

وہ ٹیبل کی طرف آئی اور ایک وحشت کے عالم میں اس نے خط کو ہاتھ میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور منتشر ٹکڑے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ لیکن وہ درجنوں خطوط جو اس سے پہلے آئے تھے۔ شہر میں ان کے ایڈریس پر، ان کا کیا ہوگا! وہ خط، محبت نامے! کتنی بے باک ہو گئی ہیں آج کی لڑکیاں، ایک شادی شدہ غیر مرد سے، اس کی فنکاری کی آڑ لے کر کس بے تکلفی اور بے باکی سے رومان لڑاتی ہیں۔ اپنا ابدی اور ازلی حق اس پر جتاتی ہیں۔ خط کی بات تو الگ رہی۔ ایک بار جب وہ رائٹرس سوسائٹی کی دعوت پر ان کے ساتھ گئی۔ اور وہاں جلسے میں انہوں نے اپنی کہانی پڑھی تو کتنی عورتوں نے انہیں گھیرے رکھا۔ بنی سنوری عورتوں کا ہجوم، کوئی آٹوگراف لے رہی ہے۔ کوئی کیمرہ ٹھیک کر رہی ہے۔ کوئی گلے ملنے کو بے تاب! اور وہ دور حیرت سے دیکھتی رہی۔ اور پیچ و تاب کھاتی رہی۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ جیسے اس کا ان کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور خطوں میں تو کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جاتی اس رنگین اور معطر خط کے جملے اب بھی کیڑے کی طرح اس کے ذہن میں کلبلاتے ہیں۔ "رسالے میں آئی ہوئی آپ کی تصویر طلائی فریم میں ہمیشہ میرے ٹیبل پر مسکراتی رہتی ہے۔ اور میں اس کی پرستش کرتی ہوں۔" یہ جذباتی بحران! لیکن جب چھٹیوں میں اس پہاڑی علاقے کا سکول بند ہو جائے گا۔ اور وہ دونوں گھر جائیں گے تو پہلا کام وہ یہی کرے گی کہ ان کے تمام خطوط کو بھٹی میں جھونک دے گی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

اسے اب میمونہ کی کہانی یاد آرہی تھی۔

ایک لڑکی ایک ادیب کی تخلیقات سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ ادیب

کی شخصیت کے قریب آ قدب۔ اُس سے پیار کرتی ہے۔ اور جب وہ سماج کی فرسودہ روایات سے بغاوت کر کے پیار کی دُنیا لے کر اُس کے قدموں میں آنا چاہتی ہے تو ادیب کی شادی کسی اور لڑکی سے ہوتی ہے۔ اور وہ ایک المیہ کردار بن کر پیار کی لاش اُٹھائے پھرتی ہے۔

وہ دُور پرچھائیوں میں ڈوب گئی۔

صبح دیر سے اُس کی آنکھ کھلی۔ کیونکہ رات گئے تک وہ سو نہ سکی تھی۔ اُس کے جسم کا ہر حصّہ درد کر رہا تھا۔

وہ اُٹھی۔

اُس کے چہرے پر گہری افسردگی تھی۔ اور ماتھے پر فکر کی لکیریں۔

"طبیعت اچھی ہے رضو، رات بھی جلدی ہی ــــــ"

"آپ کو کہانیاں جمع کرنے اور محبّت ناموں کے جواب لکھنے سے فرصت ملے تو کسی اور کی خیریت پوچھیں"

وہ غصّہ اور تلخی سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

اور وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

تین دن گزر گئے۔ وہ اُن سے دُور دُور رہی۔ وہ رُخ بدل بدل کر بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن وہ سختی سے ٹالتی رہی۔ گھر میں وحشت اور نحوست کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ دن بھر اسکول میں رہتی اور وہ چُپ چاپ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ اب ڈیرے سے باہر قدم بھی نہ نکالتے۔ وہ حیران تھے کہ آخر رضیہ کو کیا ہو گیا ہے۔

وہ اتوار کو ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ اور دوسرے کمرے میں رضیہ اسکول کی ساتھی میمونہ کو چائے پلا رہی تھی۔

اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اُن کے کمرے میں آئے۔ اُن کی آنکھوں میں شرارت کھیل رہی تھی۔

"ارے آپ؟"

میمونہ بوکھلا گئی:

"اور آپ ۔۔۔ ہا ہا ہا۔ آپ کی تبدیلی ہوگئی ہے۔ رضیہ کہہ رہی تھیں، پتا بھی کوئی اور ہوا تھا۔ آپ نے تو رضیہ کو بتایا ہی ہوگا ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔" الفاظ مشکل سے اُن کے منھ سے نکلے۔ اور وہ ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بیٹھے۔

رضیہ اس ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور صدمے کے ساتھ! ایک چیخ اُس کے گلے میں اٹک گئی۔

میمونہ کی کہانی کے کردار حقیقت بن کر اُس کا منھ چڑا رہے تھے۔

ایک دن وہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑی۔ ایک دھماکا ہوا۔

"کب تک میں اس بوجھ کو لئے پھروں! کب تک میں اپنے آپ کو دھوکے میں رکھوں! آپ نے مجھے ایک گڑیا سمجھ رکھا ہے۔ مجھ سے کھیل رہے ہیں آپ! ایک عورت کے جذبات کی توہین کی ہے آپ نے۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ آج سے آپ میرے بن کر رہیں گے یا اپنی کہانیوں کے۔ میں آپ کی اِن کہانیوں سے نفرت کرتی ہوں جنھوں نے میری زندگی کا سکون لوٹ لیا ہے مجھے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا ہے۔"

وہ چیخ رہی تھی۔

وہ غصّہ اور افسوس سے کانپ رہی تھی۔

"ارے بس اتنی سی بات ہے۔ میں تو سمجھا تھا خدانخواستہ کوئی سنگین جرم کیا ہے میں نے۔ تمھاری خاطر تو میں ایک آن میں جان دے سکتا ہوں۔ اور یہ تو معمولی بات ہے۔ مجھے معاف کر دو ساتھی! میں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ یہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔"

انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی کر کے دکھایا۔ وہ ادب کی دنیا سے یوں الگ ہو گئے جیسے کبھی بھول کر بھی ان کا گزر اس طرف نہ ہوا تھا۔ وہ دن بھر کسی کام میں رہتے۔ سگریٹ پر سگریٹ پیتے۔ رات گئے تک رضیہ کے پاس بیٹھے رہتے۔ ہنستے، باتیں کرتے، زندگی کی باتیں کرتے۔ رضیہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے دیکھتی رہی۔ لیکن کبھی کبھی وہ سوچتی، وہ دبلے کیوں ہوتے جا رہے ہیں اور کسی وقت ان کی گہری خاموشی اسے کھٹکتی۔ لیکن وہ ہر بات کو ہنسی میں ٹال دیتے اور وہ بھی ہنس پڑتی۔ دو ہفتے اور گزر گئے۔ خزاں کی دھند اور زیادہ گہری ہو گئی۔ سرد ہوا کے جھکڑ چلنے لگے درختوں کے پتے جھڑ کر میدانوں اور پگڈنڈیوں پر ڈھیر ہونے لگے ——

ایک دن وہ اسکول سے آ رہی تھی۔ ڈیرے کا راستہ جیسے لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ میمونہ، اس کی بے تکلف ساتھی جا رہی تھی شہر۔ اس کی شادی ہو رہی تھی، اور جانے سے پہلے اس نے ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط دیا تھا۔ "میری شادی ہو رہی ہے اور مجھے اپنی ان دیکھی محبوبہ کا انتظار ہے۔ وہ میرے ابد اور ازل کی ساتھی ہے۔ یہ بات اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔" اور میمونہ کہتی رہی۔ "انھوں نے ہر وقت میری غلط

بھی دور کر دی تھی۔ کتنے عظیم انسان ہیں آپ کے شوہر! کتنی خوش نصیب ہیں آپ!!"

وہ جب کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا وہ بستر میں لیٹے ہیں۔ چپ چاپ عینک کے پیچھے چھپی ہوئی سیاہ آنکھوں میں گہری افسردگی لیے، چہرے پر اتنی زردی جیسے وہ کئی مہینوں سے بیمار ہوں!

اُس کے کلیجے میں جیسے تیز چھری اتر گئی۔

اُس کے احساس میں ایک بجلی سی چمکی، لہرائی۔

"اُٹھیے، کیوں لیٹے ہیں آپ؟" اُس کی نگاہوں سے یک لخت کئی پردے سرک گئے۔ کئی آئینے جگمگائے!!

بس یونہی!

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"میرے بیٹے ایک کام کرنا ہے آپ کو۔ بس ابھی کریں گے آپ!"

وہ اُن کے ہاتھ کی لمبی لمبی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

"تم حکم دو میں حاضر ہوں!"

"ایک کہانی لکھیے، پلاٹ میں دے رہی ہوں!"

"سچ ......؟"

وہ بستر سے اُچھل پڑے۔

"اور کیا، میں جھوٹ نہیں کہتی ہوں!"

"تو کیوں نہ تم پر ہی ایک کہانی لکھ ڈالوں"

اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ شروع کیجیے ——— یہ دیا پیٹر! اور یہ ہے آپ کا بین، میں چائے بناتی ہوں"

تھوڑی دیر پہلے جب یہ ہیر کی جگمگاتی ہوئی رنگین فضا میں آنے سے پہلے
وہ سسرالوں سے دور۔ اپنی کوٹھی میں ایک سجے سجائے قید خانے میں
رنگ محل کی کوئی اسیر شہزادی۔ تنہا، اداس، حیران۔ کوٹھی کے چاروں طرف
گھنے درختوں کی سائیں سائیں کرنے والی آواز جہاں دہشت کے سائے ہیں اور
دن رات سناٹا ہے۔

اور وہ گھبرا جاتی ہے۔

رنگین دریچے سے ہٹ جاتی ہے۔

دریچے بند ہوتے ہیں۔

وہ کتابوں میں پناہ لینا چاہتی ہے۔ کمرے کی دیواروں پر قرینے سے رکھی
ہے۔ نفیس بیڈ پہ دراز ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ [illegible] ذہنی تھکن اور جسمانی
اکتاہٹ کو جبراً بھلانا چاہتی ہے۔ اٹھتی ہے۔ کمرے میں ٹہلتی ہے۔ بیٹھ

جاتی ہے۔ وہ پہنچنا چاہتی ہے لیکن۔۔ پہنچ نہیں سکتی۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔
اپنی بے بسی پر تلملا اٹھتی ہے اور شنکر کے خلاف اس کے دل میں نفرت کی
ایک لہر اٹھتی ہے۔ ایک تند و تیز لہر۔ یہ لہر طوفان کی شکل اختیار کرتی ہے۔
طوفان پھیلتا ہے اور ساری کائنات ڈوب جاتی ہے۔

وہ جب [illegible] بھی گھر آتے، دوسرے ہی دن یا بیس پچیس دنوں کے
بعد، تو ہر چیز اپنی جگہ پر دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا۔ ایک دو روز ٹھہر کر وہ پھر
اپنے ٹھیکے کے مقام پر جاتے۔ وہ عام طور پر جنگلات کے ٹھیکے لینا پسند
کرتے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دور افتادہ جنگلات میں گزر چکا تھا۔
روپیہ کمانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے گھر کے عیش و آرام کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔
اپنے اس مقولے پر سختی سے عمل بھی کرتے۔ گھر کے تمام عیش و آرام کو ترک
کرکے ہی انہوں نے دولت کمائی تھی۔ ان کی دولت اور جائداد کی شہرت
سارے شہر میں پھیل چکی تھی اور غالباً اسی لئے جب ان کی پہلی بیوی مر گئی
تو ان کے نام بڑے بڑے گھرانوں نے پیغام بھیجے اور کستوری کے والد ریٹائرڈ
میجر صاحب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ انہوں نے بھی اس کا ذکر گھر میں کیا۔
کستوری چونک اٹھی۔ اس کی انفرادیت کو چوٹ سی لگی۔ لیکن جب ایک
دعوت میں پتا جی نے ان کا تعارف کرایا تو وہ شنکر سے مرعوب ہوئی۔
ڈارک بلیو سوٹ میں ایک وجیہ انسان۔ بھرا بھرا چہرہ، فراخ ماتھے پر خوب
صورت سلوٹیں۔ ناک ذرا موٹی۔ گھنی مونچھیں۔ شنکر کا سراپا اس کے
ذہن پر نقش ہو گیا۔

نہ جانے اس آدمی کی شخصیت میں کیا بات تھی کہ وہ یونیورسٹی کے
رمیش کو بھی بھول گئی۔ رمیش جو اپنے کھلنڈرے پن کے باوجود اسے پسند تھا

اور رشمی نے جب بھی اسے اپنے ساتھ ہوٹل، کلب چلنے کو کہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ اور اس نے رشمی کے ساتھ کئی خوب صورت شامیں گزاریں اور جس شام وہ ساتھ رہے وہ رات ایسے خوابوں کی حزن و مسرت میں ڈوب ڈوب گئی۔

اور پھر پروفیسر تھی۔

"وہ بھی تو آپ کے دونوں میں سے تھے۔

لیکن شادی ——— ؟

ان دنوں سنجیدگی بہت دل کشی رکھتی تھی۔ باتیں وہ کم کرتے تھے اور ان کی ہر بات بڑا وزن رکھتی تھی اور پھر ان کی سوشل پوزیشن ———

اسی سال اس کی شادی ہو گئی۔

"تم بس اب گھر کو سنبھالتی ہو۔ نوکروں کا کیا بھروسا! اور میں تو گھر میں رہتا ہی نہیں۔ مہینے میں پندرہ دن گھر میں رہنا نہ رہنا ایک ہی بات ہے کیا کروں کام ہی ایسا ہے۔ میں کام ہینڈل کروں گا اور تم گھر کو۔"

چند ہی روز بعد وہ ایک نو بیاہتا شوہر کی طرح نہیں، ایک بزرگ کی طرح اسے سمجھا رہے تھے۔ کھوکھلے لہجے میں۔ صاف صاف۔ وہ چائے پی چکے تھے اور باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

اور ایک چیخ اس کے گلے میں اٹک گئی۔

لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں سے سب کچھ اوجھل ہو گیا۔

شکر کی تعفیت، دو منزلہ خوب صورت نئی وضع کا بنگلہ، رنگین شیشوں سے جڑے ہوئے دریچے، ریشمی پردے، کشمیری قالین، صوفہ سیٹ۔ خوب صورت الماری میں زیوروں سے بھرے ہوئے صندوق۔

"ابھی تو ہماری شادی کا پانچواں ہی روز ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

وہ کہنا چاہتی تھی لیکن نہ کہہ سکی۔ اور خاموشی سے اس نے پیالیاں ٹرے میں اٹھائیں اور کچن کی طرف چل دی۔

اس نے ٹرے الماری میں رکھ دی۔

وہ رُک گئی۔

کچن کی کھڑکی سے باہر بہار کی دھندلی سی دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس کی خاموشی میں کئی طوفان جاگ رہے تھے۔ اور جیسے وہ خود سو رہی تھی۔

اچانک کچن کے باغ کی طرف کھلنے والے دروازے کی آواز آئی۔

وہ چونک گئی۔

"کیا ہے؟"

وہ نفرت سے بولی۔

اور نوکر کہنے لگا۔

"آپ نے ــــــ آپ نے کہا تھا نا جی، کل ــــــ"

"صرف کل کل ہی کرتے رہو گے یا کچھ کہو گے بھی؟"

"وہ آگئے جی آپ کے۔ ۔ ۔ ۔"

اوہ، لتا ہو گی اور رمیش۔ وہ انفارمیشن لے کر آئے ہوں گے۔ اور۔ ۔

آج شام وہ اپنے فرینڈز کو پارٹی دے رہی ہے۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی۔ نان سنس! وہ جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔ ایک نئی ترنگ کے ساتھ۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ لیکن پہلے انہیں خبر تو دے۔ وہ جا رہے ہیں۔ وہ جلدی سے واپس مڑی۔ اپنے کمرے میں آئی۔ وہ کپڑے پہن کر تیار ہو چکے تھے۔

"ہاں اب جا رہا ہوں۔ سویرے ہی آدمی آیا تھا۔ دو دن سے وہاں
کام رُکا پڑا ہے۔"

"لیکن میں آج شام کو اپنی سہیلیوں کو پارٹی دے رہی ہوں۔" وہ
سر جھکا کر بولی۔ "اور مسٹر رمیش اور مس لتا آپ سے ملنے آئے ہیں۔ آج
آپ کا یہاں رہنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرا یہاں رہنا کوئی ضروری نہیں۔ بزنس کا معاملہ اہم ہوتا ہے۔
تم خود مہمانوں کو اٹینڈ کرو گی۔ اور دل سچ پوچھو تو مجھے ہوٹلوں میں پارٹیاں
دینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ٹائم ویسٹ ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ نکلے۔ اور وہ اُن کے پیچھے پیچھے نکلی۔ حواس باختہ،
اُسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں رسمی تعارف کے بعد وہ چلے
گئے۔ اور کشوری نے دل پہ پتھر رکھ کر رمیش اور لتا کے قہقہوں میں
برابر کا حصہ لیا۔ اُس کی اداکاری کامیاب رہی۔ یونیورسٹی میں کئی ڈراموں
میں وہ خوب صورت اداکاری کے لئے انعامات پا چکی تھی!

شام ہو چکی تھی ——————

اور اب پریڈ کی جگمگاتی ہوئی رنگین فضا کی مسرت اور رونق کو
چار چاند لگ رہے تھے۔ مرمر کے دمکتے ہوئے ٹیبلوں پر روشنی کے
گلاسوں میں چاند پگھل رہے تھے۔ دَور چل رہے تھے۔ مسکراہٹوں کی
کلیاں کھل رہی تھیں۔ قہقہے اُبھر رہے تھے۔ رنگ و نور کی موجیں رقصاں
تھیں۔ تقریباً ہر مرد کے سامنے ٹیبل پر اُس کی عورت تھی۔ بنی سنوری۔
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے سانسوں کے تصادم میں گلاب مہک رہے
تھے۔ راز و نیاز کے لمحے مستی سے بوجھل ہو رہے تھے۔ پریڈ سے کے

بوائے سفید براق وردی پہنے پھرتی سے میزوں پر آرڈروں کی تعمیل
کر رہے تھے۔ اور کشوری کافی کا ایک کپ پی کر اب رمیش کی آنکھوں کی
شرابی لہروں میں ڈوب رہی تھی۔ اس نے آج تنگ پائنچے کی دودھیا
رنگ کی شلوار اور جدید ترین ڈیزائن کا چست ریشمی فراک پہن رکھا تھا۔
بالوں کو آج اس نے ایک ہی گھنی چوٹی میں گوندھا تھا اور اس میں گلاب
کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ رمیش نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر وسکی کے
چند پیگ پی لئے تھے۔ اور اب اس کی رگ رگ میں آگ دوڑ رہی تھی۔
اچانک کچھ دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے آرکسٹرا میں حرکت آگئی۔
زمزمے جاگ اٹھے۔ سبھوں کی نظریں ایک دم سامنے رنگین جھالروں
سے سجائے گئے اسٹیج پر ڈارک بلیو کے سوٹوں میں ملبوس سازندوں کی
طرف اٹھیں۔ سازندوں نے روک اینڈ رول کی ایک دھن چھیڑ دی تھی
اور سامنے کی ٹیبل پر بیٹھی ایک حسین جوڑی تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے
مرمریں فرش پر آگئی تھی اور اب باہوں میں باہیں ڈالے ناچ رہی تھی۔

"ایک بات کہوں؟"

رمیش کے لہجے میں جیسے موج سی تھرتھرائی۔

"ہوں!"

"یاد ہے وہ شام جب ——"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور لائٹر سے سگریٹ جلایا۔

کشوری کے لاشعور میں کئی شاموں کے سائے لہرائے۔

"جب ——"

اس نے سگریٹ کا کش لیا۔

آن کی نمازیں اُلجھتی گئیں۔

"جب پہلی بار تم میرے ساتھ ناچی تھیں"

"اوہ ————!"

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ حسرت میں ڈوبے ہوئے دن تو خواب بن چکے ہیں۔ وہ اداس ہوئی جب سے اُس کی شادی ہوئی۔ اس کی آزادی اور مسرت چھن گئی۔ وہ کوٹھی کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ گئی۔ باہر کی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ شوہر ہفتہ میں ایک دو بار گھر آتے اور وہاں بھی وہ ہر وقت حساب کتاب میں اُلجھے رہتے۔ اور وہ چند لمحے اس کے ساتھ یوں گزارتے جیسے کسی کاروباری معاملے سے نمٹ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی نہ محسوس کر سکتے تھے کہ وہ انسان ہے، وہ زندہ ہے۔ زندہ رہنے کا حق کوئی بھی اس سے چھین نہیں سکتا۔ اور پھر ان کی ناراضگی اور سنجیدگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ اب تنہا اور دوسری سہیلیوں کے ساتھ کبھی کبھی ..ت [illegible] کا پروگرام بنا لیتی۔

اور ایک دن جب وہ ایک سہیلی کے ساتھ شام کو ..ریڈیو [illegible] کے لئے گئی تھی تو وہ اچانک آگئے تھے اور کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے انہوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور پھر انہوں نے سیدھے منہ اس سے بات بھی نہ کی۔ اور وہ بھی خاموش رہی

خاموشی کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا!

اور آج وہ پھر تنہائی کی وحشت سے گھبرا کر قید خانے سے نکل آئی تھی رنگ محل کی اسیر شہزادی دیوار پھاند کر نکلی تھی۔ بلیوارڈ پر اچانک رمیش سے ملاقات ہوئی۔ اور تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ رمیش

کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھی، اور اب وہ پریمیر کی رنگین اور ہنکتی ہوئی فضا
میں سانس لے رہی تھی
چند لمحے گزر گئے۔
یہ لمحے اُس کی زندگی تھے۔
آرکسٹرا کی دھنیں چراغاں کر رہی تھیں۔
اُس کی رگ رگ میں ایک نشہ اُتر رہا تھا۔ یہ نشہ اُسے کہاں لے
جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوابوں کی دھند چھا رہی تھی۔ اور اس
نرم رُوپہلی دھند میں کوئی اُسے بلا رہا تھا۔

اور دوسرے لمحے وہ مرمریں فرش پر رنیش کے ساتھ ناچ رہی تھی۔
اُس کی رُوح آزادی کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کر رہی تھی۔ اُس
کے عارض گلنار ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں چاند ستارے رہے تھے۔
ہونٹوں سے امرت برس رہا تھا۔ جسم کی ہر حرکت سے نغموں کا دل دھڑک
رہا تھا۔ اور جب وہ تیز دھن پر مدہوش ہو کر لڑکھڑانے لگتی تو رنیش
آہستہ بازوؤں کے حلقے میں تھام لیتا۔ اُسے اپنے وجود کا احساس ہی نہ رہتا۔
کاش یہ لمحے دائمی ہو جاتے۔
لیکن یہ لمحے سمٹ گئے۔
اور جب آرکسٹرا کے ساز تھرتھرا کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے
زور زور سے تالیاں بجائیں۔ وہ رنیش کے بازوؤں سے الگ ہو گئی۔
وہ اپنے ٹیبل کی طرف جھکی، کھوئی کھوئی سی، سرشار، مغرور۔ اُس کا بدن
پسینے کی خوشبو میں نہایا ہوا تھا۔
"ہیلو روزی ______"

رمیش نے نعرہ لگایا۔ اُس کے پیچھے سے۔

"ہیلو ڈارلنگ!"

اُس نے مڑ کر دیکھا۔

رمیش ایک لڑکی سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

اور وہ لڑکی اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

اچانک خوابوں کی دھند چھٹ گئی۔

دوسرے لمحے وہ لڑکی رمیش کے بازوؤں میں جھول رہی تھی!

ساز پھر بیدار ہو چکے تھے۔

وہ تڑپ کر کرسی پر آ گری۔ پر میز کی فضا دھوئیں سے بھر گئی۔ چراغ بجھ گئے۔ خوشبو زہر بن گئی۔ اور نغموں کے سانپ لہرائے۔ لوگوں کے اتنے ہجوم میں رمیش نے اُس کی بے عزتی کی تھی۔

لوگ اُس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

وہ غصہ اور ندامت سے کانپ رہی تھی۔

وہ اچانک دُور اندھیروں میں ڈوبنے لگی۔

تہہ در تہہ اندھیرے ......

اندھیرے لپک رہے تھے۔

اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے رمیش کی کرسی پر شنکر بیٹھے تھے۔

"ارے ————"

وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر تاریکی تھی۔ جیسے تاریکی کا کوئی مجسمہ ہو۔ اُن کے بال منتشر تھے۔ کپڑے گرد

آلود، جیسے وہ ابھی ابھی شہر سے آ گئے تھے!

"آپ ـــــــــــ ؟" اُس کے حواس پر بجلی گر پڑی۔

شنکر نے گردن دوسری جانب پھیر دی۔

کشوری کی پلکیں کئی بار جھپکیں۔ یہ سب کچھ خواب ہی تو نہیں ـــ محض چھلاوا!

"میرا مطلب ہے آپ ـ آپ سیدھے گھر سے .. "

اُس کے ہونٹ کانپے۔

اور اس کے جواب میں شنکر نے لمحہ بھر اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے اُن کی تاریک آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"میں شنکر نہیں ہوں۔ وہ شنکر جسے تم جانتی ہو۔ تم مغالطے میں ہو" پھر اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا۔ جس میں ادھ جلے سگریٹوں کا ڈھیر تھا اور دروازے کے رنگین پردوں میں غائب ہو گیا۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ آرکسٹرا کی دھنیں تیز ہو رہی تھیں۔ رقص کی لہروں نے طوفانی ادا آ رہی تھی!

سب مست تھے۔ جھوم رہے تھے۔

وردی پوش نما بوائے لوگوں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔

"بند کر دو یہ ساز!"

اچانک کشوری کی روح چیخ اُٹھی۔ لیکن ساز نقطۂ عروج کو چھو رہے تھے۔ وہ ہونٹ چباتی ہوئی اُٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔

اور جب وہ رات کے گھُپ اندھیرے میں ٹیکسی لے کر کوٹھی پہنچی تو اُس نے بستر پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ نوکر کے الفاظ آ رہے تھے سکون دے رہے تھے۔

"نہیں جی۔ صاحب نہیں آئے ہیں۔ وہ تو اتوار کو آنے کو کہہ گئے ہیں ــــ!"

وہ تینوں سنگ آگ کے چھوٹے سے ریستوران میں گرم گرم چائے پی رہے تھے۔ ٹیبل کے ایک طرف پرانے ڈیزائن کے میلے صوفہ سیٹ پر مسز رمیش بیٹھی تھیں۔ اور مس شانتی بھاٹیہ۔ مسز رمیش سانولی سی رنگت کی، چھریرے بدن کی خوبصورت عورت تھی۔ چہرے پر بشاشت، آنکھوں میں ذہانت اور گہرائی۔ لہراتے ہوئے لمبے لمبے بال، مس شانتی بھاٹیہ کے گول گول جسم سے موٹاپے کا احساس اس کی شوخ اور مسکراتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر مٹ جاتا۔ اس کا منہ قدرے چوڑا تھا اور ہونٹ بھدے۔ لیکن سفید دانتوں کی خوب صورتی کو دیکھ کر اس کے حسن کا قائل ہونا پڑتا۔ اس کے حسن کا بڑا سرمایہ یہی موتی جیسے سفید دانت تھے۔ سامنے اونچی سیٹ والی کرسی پر رمیش بیٹھا تھا۔ رمیش کے گول گول چہرے پر گول گول آنکھیں، ہلکے سے نیلے رنگ کی طلائی فریم والی عینک کے پیچھے ایک ملائمیت، ایک جاذبیت لیے ہوئے تھیں۔ چمڑے کے زپ والے گرم قیمتی کوٹ اور مری میں خریدے ہوئے ولائتی جگر اور چوڑے مفلر میں، اس وقت

وہ ایک بھولا ہوا فٹ بال معلوم ہو رہا تھا۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے۔ اس کی بیوی نے ایک دو بار اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا اتر آیا اور اس نے احساسِ مسرت سے، مغرور آنکھوں سے شستی کی طرف دیکھا۔ جو ابھی ابھی ریستوران کی خاموش، ساکن اور سرد فضا میں ایک بے باک قہقہہ بکھیر چلی تھی، ایک قہقہہ ایک شعلہ!

ہوا یوں کہ ایک ٹورسٹ بس سے اترتے ہی چند مرکبان ان کی طرف دوڑتے ہوئے آئے اور لگے اپنے اپنے گھوڑوں کی تعریفیں کرنے۔ منت سماجت کرنے۔ ایک عجیب سی بولی میں۔ مس بھاٹیہ اس شدید سردی میں ان نیم عریاں جسموں والے انسانوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ ایک اس کی طرف لپکا۔ میلی سی زرد آنکھوں اور الجھی ہوئی، بڑھتی ہوئی داڑھی کے ساتھ۔ اور میم صاحب! میم صاحب! اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا۔ قریب قریب اس سے لپٹ گیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ عجیب جانور ہے۔ اور پھر جب رمیش نے ان سبھوں کو ڈانٹا، بھگایا اور وہ ریستوران میں داخل ہو گئے تو مس شستی نے اپنی فطری شوخ طبعی کے تحت مسز رمیش کے کان میں کچھ کہا تو دونوں کے قہقہے چھوٹ گئے۔ اور مسز رمیش نے شرماتے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی، جوابی حملے کے طور پر، تو مس بھاٹیہ کا قہقہہ ایک شعلہ بن کر لہرایا۔

کونٹر پر بیٹھا ہوا، سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ان آنکھیں باہر نکال کر ان وزیٹروں کو دیکھ رہا تھا جو اِن سردیوں میں گلمرگ جا رہے تھے۔ برف کا لطف اٹھانے اور سکیئنگ کرنے کے لئے۔ اس کی آنکھوں میں حقارت کا سایہ لہرایا۔ جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ انگریزوں کی

بات اور تھی۔ یہ بابو لوگ خاک لطف اُٹھاتے ہیں گلمرگ کا۔ یہ لوگ تو۔ ۔ ۔

"ہیلو ڈاکٹر!"

رشمی نے تپاک سے ڈاکٹر سپرو سے ہاتھ ملایا۔

ادھیڑ عمر کا یہ زور زور سے باتیں کرنے والا ڈاکٹر ریستوران میں داخل ہوکر ان تینوں کے سامنے ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ رشمی نے اُسے فوراً پہچان لیا حالانکہ لمبے چوڑے اوور کوٹ کے لمبے لمبے کالروں نے اُس کے چہرے کے کئی نشیب فراز چھپا لئے تھے۔

"ہلو!"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔

"ہو ڈو یو ڈو!"

"ہو ڈو یو ڈو!"

"یہ ہیں میری وائف"

"ہو آر یو۔ ۔ ۔" مسز رشمی نے خوش ہو کر کہا۔

"آئی ایم آل رائٹ۔ ۔ ۔ تھینک یو"

ڈاکٹر سپرو کسی بوڑھے انگریز کی طرح بول رہے تھے۔ آن کے لہجے سے ریستوران کی بے حس اور ساکن فضا غرّائی۔ اُنہیں یاد آیا کہ جولائی میں دونوں میاں بیوی گلمرگ کے ہسپتال میں آن سے ملے تھے۔ مسز رشمی کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تھی اور اُن کے انجکشن لگوانے سے وہ ٹھیک ہوئی تھیں۔ وہ ہنی مون کے لئے بمبئی سے گلمرگ آئے تھے۔ اور اُنہوں نے کہا تھا کہ جاڑوں میں وہ پھر انجوائے کرنے ضرور آئیں گے۔

"اور یہ ہیں میری ڈئیریسٹ سہیلی مس بجاشیر!" مسز رشمی نے چہکتے

ہوئے کہا۔ گرمیوں میں یہ ضرور ہمارے ساتھ آئیں لیکن ان کا ہاؤس
ایگزیمیشن چل رہا تھا۔"
شبنمی دھیرے سے مسکرائی۔
موتیوں کی لڑی چمک اٹھی۔
"یہ ڈاکٹر سپرو ہیں۔" رمیش مس بھاٹیہ سے مخاطب ہوا۔ "ان سے
خوب ملاقاتیں رہی ہیں جولائی میں۔ ہمارے اولڈ فرینڈ ہیں۔"
"او، تھینک یو ویری مچ!"
"ہم نے انہیں بمبئی آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن . . . ."
"آئی ایم ریلی ویری سوری۔" ڈاکٹر سپرو نے بے چینی سی محسوس کی
اور مسز رمیش کی بات کاٹ دی۔ "ہوا یہ کہ میری لیو ڈیو نہیں تھی۔ ڈانڈ کی
شادی پر لیو لے چکا تھا میں۔"
"اچھا ڈاکٹر گڈ بائی!"
رمیش اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ آج ہی گلمرگ جا رہے ہیں؟"
"جی ہاں!"
"کتنے دن رہیں گے؟"
"دس دن کا پروگرام ہے۔"
"وش یو ہیپی ٹائم؟"
"بائی بائی!"
"بائی بائی!"
ان تینوں میں سب سے زیادہ مسرور مسز رمیش تھی۔ اس کا

انگ انگ احساس مسرّت سے ناچ رہا تھا۔ اس ٹور میں اس کی عزیز ترین ہیلی اُس کے ساتھ تھی۔ اس کی اپنی شیشی، اس کی دوست غمخوار، راز دار، اُن کی دوستی کا ہر جگہ چرچا تھا۔ اور کتنی لڑکیاں اُنہیں رشک سے دیکھتی تھیں۔

اور اُس کا پیارا شوہر!

اُسے اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ جب سے وہ رمیش سے بیاہی گئی تھی اُس کے ارمانوں کے پھول کھِل اُٹھے تھے۔ اُس کے پاس اب کس چیز کی کمی تھی رمیش اپنے باپ کی بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ اب وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس حاصل کرے گا۔ اور پھر . . .

رمیش اُس کا تھا۔ صرف اُس کا، وہ اُس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ اُس کے ناز اُٹھاتا۔ اُس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچتی کیا مرد اتنی شدت سے پیار کر سکتا ہے؟ اور خود بخود اُس کی بوجھل پلکیں بند ہو جائیں اُس کی بند پلکوں پر سلگتے ہوئے ہونٹوں کے سائے لہراتے۔ رمیش کو پاکر اُسے ساری کائنات مل گئی تھی۔ شادی کے بعد جب اُس نے ایک بار بمبئی سے دور، دوہار لیک کے کنارے، کشمیر کا ذکر کیا تو اگلی صبح کشمیر جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ اور دوسرے ہفتے وہ کشمیر کی مہکتی ہوئی بہاروں میں سانس لے رہے تھے اور پھر آج . . .

آج وہ گلمرگ میں تھی۔

سامنے گلمرگ کے جنتِ نگاہ نشیب و فراز تھے۔

سبزے کا مخمل اپنا رنگ بدل چکا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، وقار تھا، سکون تھا۔ دور دور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنی ہوئی جھیل لہراتی

ہوئی دُھند میں سو گئی تھیں اور آسمان پر بادلوں کا ایک شامیانہ تن گیا تھا۔ رُومان اور شعریت میں ڈوبا ہوا ماحول۔

ابھی ابھی جب وہ گھوڑے سے اُتر رہی تھی اور گھوڑے والا اُسے سہارا دے رہا تھا تو اُس نے کہا کہ اِس سال کی پہلی برف گر چکی ہے۔ لیکن صرف ایک دن کے لئے۔

اور اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر برف کب گرے گی؟"

"اب برف جلدی گریگا میم صاحب!"

ایک نامعلوم مسرت سے وہ جھوم اُٹھی۔ بچپن سے جس حسین خواب کو وہ آنکھوں میں بسائے ہوئے تھی اُس کی تعبیر سامنے تھی۔ وہ خوابوں کے جزیروں میں تھی۔ اور خوابوں کا شہزادہ؟

اُس نے سامنے کی ڈھلوان کی طرف دیکھا۔ جس کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے وہ بڑی شان اور مسرت سے گھوڑے کی لگام سنبھالے ہوئے وادی میں اُتر آئی تھی اور پیچھے پیچھے بوڑھا مرکیان ہانپتے ہوئے، دوڑتے ہوئے آرہا تھا۔ پیٹھ پر اپچی اور بستر لئے ہوئے۔ اُس نے رمیش اور ششی کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اور خود آگے نکل آئی تھی۔ رمیش تو ضرور اُس سے آگے نکل جاتا۔ لیکن ششی گھبرا رہی تھی جب کہ گھوڑا تنگ راستے کے کنارے کنارے دوڑنے لگتا۔ بائیں جانب تو نیچے گہرے کھڈ میں ڈھلوان جاتی تھی۔ بڑی لرزہ خیز۔ گرمیوں میں جب وہ پہلی بار اِس راستے گھوڑے پر چلی تو اُس کی چیخ نکل گئی تھی اور رمیش جو اُس سے چند قدم آگے تھا فوراً رُک گیا تھا اور گھوڑے والے نے اُسے خوب تسلّی دی تھی۔

"آہا! وہ دونوں آ رہے ہیں، ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ" وفورِ مسرت سے وہ چلائی۔ لیکن کچھ فاصلے پہ دو چار مرکب ان گھوڑے تھے وہ نہ جانے کیا محسوس کریں گے۔ اس نے ضبط سے کام لیا۔

آج اس کی مسرت دوگنی تھی۔

اس کے ساتھ ششی بھی تھی۔ ششی اس کی بچپن کی سہیلی، اس کی جان جان، گرمیوں میں اس کے بغیر سارا لطف ادھورا رہا۔

لیکن آج ششی اس کے ساتھ تھی۔ . . . . !!

اچانک گلمرگ کی سرد اور یخ بستہ فضاؤں میں بہاروں کی رنگینی اور تازگی دوڑ گئی۔ ڈھلوانوں پر چیل اور دیودار کے درخت ریشمی دھند میں مسکرانے لگے؛

اور جب ششی رمیش کے بازوؤں کے سہارے نیچے زمین پر آ گئی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنی کھلی باہوں میں لے لیا۔ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں جھول گئیں۔

اور رمیش مسکراتا رہا۔

کتنا حسین منظر تھا وہ!

گرینڈ ہوٹل کے چھوٹے سے خوشنما ہال میں رنگین دیوار کے ساتھ شیشے لگے ہوئے چوڑے دریچوں کے ساتھ لوہے کی گول بخاری جل رہی تھی۔ بخاری کے اندر سوکھی لکڑیاں چیخ چیخ کر جل رہی تھیں سارا کمرہ گرم تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی گرمی اور آسودگی کا احساس ہوتا۔ وہ تینوں ابھی ابھی تھک ہار کر واپس لوٹے تھے۔ کل کی طرح

آج بھی انہوں نے گلمرگ کی خوب سیر کی تھی۔ کلب روڈ پر گھوڑے کی سواری کی تھی۔ کل کی شام مسز رینش کی آنکھوں کے سامنے لہراتی رہی۔ کل کی شام کلب میں گزری تھی۔ وہسکی کی آگ میں پگھلتی ہوئی شام۔ اور پھر وہ رینش کے گرم جسم سے لپٹ کر ناچتی رہی۔ ناچتی ہی رہی اور پھر رینش نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر صوفہ پر بٹھا دیا۔ اور وہ ششی کے ساتھ ناچتا رہا۔ وہ دور سے رینش اور ششی کا ناچ دیکھتی رہی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گلمرگ کی ڈھلوانوں پر میرین ڈرائیو کے چراغ جل رہے ہیں۔ رینش نے ششی کو کبھی غیر نہیں سمجھا تھا۔ کتنا گریٹ ہے رینش۔ اور پھر رات گئے جسموں کو کشمیری شالوں میں لپیٹے اور اوورکوٹوں میں چھپائے۔ وہ ہوٹل کی طرف چلتے رہے۔

کتنی پراسرار رات تھی۔

آسمان پر بادل ایک ہلکی دھند کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس لرزتی دھند کی گہری تہوں میں چاند جھینپ رہا تھا۔ اجنبی راستوں پر نرم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

ٹھنڈی چاندنی

ٹھنڈی آگ!!

اور وہ ساری رات اس ٹھنڈی آگ میں نہاتی رہی۔

اور آج وہ گھٹنوں تک خود رو سبزے پر چلتے رہے، دوڑتے رہے، پھسلتے رہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ان کے خون کو منجمد کر دیا تھا۔ آج سردی زیادہ تھی۔ ہوٹل کے بوائے نے سویرے ہی کہا تھا۔ آج ضرور برف گرے گی۔ وہ تینوں بے چینی سے اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب ان کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے ریشمی برف گرے گی۔ دو بجے تک وہ ٹہلتے رہے۔

دور جنگلوں کی نامعلوم راہوں پر چلتے رہے۔ اور اُنہوں نے بہت سے SNAPS لئے۔ کتنے حسین نظاروں کو اُنہوں نے قید کر لیا۔ کتنے رنگین لمحے امر ہو گئے!!

آج اُن کی مسرت انتہا پر تھی۔

وہ تینوں ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ وہسکی کی مدھم آگ اُن کی رگوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اور وہ بہت بے تابی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

جادو کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

باہر برف کے ریشمی گالے دھیرے دھیرے ہولے ہولے، رقص کی ایک ادا کے ساتھ نیچے آ رہے تھے۔ وادی کے نشیب و فراز پر چاندی کا فرش بچھ رہا تھا۔

تینوں کے دل ایک ہی جذبے سے دھڑک رہے تھے۔ مسرت اور حیرت کا بے کراں جذبہ!

بمبئی کی مشینی، تیز رفتار اور ہنگامہ پرور زندگی میں اُنھیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ زندگی اتنی خاموش اور پُرسکون ہو سکتی ہے۔ اور اتنی مدھم مدھم!!

اتنی خواب آگیں!!! اور اُن کی حقیقی زندگی پر خوابوں کا گمان ہو گا۔ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اُن کا وجود برف کے گالے کی طرح پگھل کر رہ جائے گا ——!

ابھی برف کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

اور ابھی اتنی ساری برف!

تینوں مسرت سے چلائے۔ جھوم جھوم اُٹھے۔ اور تالیاں بجانے

لگے ـــــــــ !!

"بھئی، میجک ہے میجک!"

رمیش کے منھ سے بے اختیار نکلا۔

اُس نے ششی کی طرف دیکھا۔

ششی کا کنوارا چہرہ آگ کا انگارہ بن چکا تھا۔

"شاید ہم میجک لینڈ میں آ گئے"

ششی کے موتی جیسے دانت چمکے۔

"مگر نہیں، یہاں بیجشن بھی موجود ہے" مسز رمیش نے کنکھیوں سے خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی نہیں۔ اُس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ اُس کے جسم میں سردی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ دراصل آج اُسے بہت زیادہ سردی لگ چکی تھی۔ مندر کے قریب سردی سے اُس کے دانت بج اٹھے تھے۔ اور ششی نے منھ کھول کر دانت کٹکٹانے سے اُس کا مذاق اُڑایا تھا۔

"کون ـــــــــ ؟"

رمیش نے دیکھا اُس کی بیوی کا چہرہ قدرے بجھا ہوا تھا۔ لیکن ششی کے چہرے کی آنچ اُس کے قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"آپ!"

ششی نے شوخی سے کہا۔

"اور ویج؟" مسز رمیش خود ہی شرمائی۔

"وہ تم ہو!"

رمیش نے بے ساختہ ششی سے خطاب کیا۔ اُسے بالکل خیال نہ رہا

کہ وہاں اُس کی بیوی موجود تھی اور وہ بھی گفتگو میں شریک تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ایسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے اوور بچ کے دو لفظ اُس کی بیوی کے بجائے شمشی نے کہے تھے۔ شرارت کے ساتھ۔

لیکن وہ تو اُس کی بیوی نے کہے تھے۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

ایک لمحہ ——— !

ایک منجمد سا لمحہ ——— !!

مسز رمیش اُٹھ کر کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ اور شمشی کے چہرے کی آگ شعلہ زار بن گئی تھی۔ وہ فوراً سنبھل گیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلئے، باہر چلتے ہیں برف میں!"

اور وہ جلدی سے کمرے میں بیوی کو لانے گیا۔

وہ کچھ دیر گھوم پھر کر، برف کے گولے ایک دوسرے پر پھینک کر برف کے بت بنا کر برفیلی ڈھلوان سے نیچے اُتر رہے تھے۔ اُن کے قدموں کے نیچے تازہ برف چرچرا رہی تھی۔ بار بار جھٹکنے کے باوجود اُن کے اوورکوٹوں پر برف کی ایک موٹی تہہ جم گئی تھی۔

وہ اب ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی کچھ ڈھلوان باقی تھی۔ رمیش نشیبی سطح پر آ گیا تھا۔ مسز رمیش بڑی بھاری قدم اُٹھا رہی تھی۔ اور اُس کے آگے آگے شمشی جا رہی تھی۔ برف جیسے مرد ہاتھ وہ جیسے سانسوں سے گرما رہی تھی۔

اور رمیش گا رہا تھا

ایک نرسری رائم۔

SNOW SNOW FASTER

WHITE ALABASTER

اچانک شی شی کا پاؤں پھسل گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ برفیلی فضا میں گم ہو گئی اور دوسرے لمحے وہ رمیش کے مضبوط بازوؤں میں تھی۔

ایک اور لمحہ گزر گیا۔

رمیش اب بھی اپنے بازو کھول دیتا تو شاید شی شی پلکیں جھپکائے ایک گٹھری کی طرح زمین پر گر جاتی۔ اور جب مسز رمیش ان دونوں کے قریب آئی تو شی شی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور وہ سر کے سیاہ رنگ کی شال پر جمی ہوئی برف جھاڑ رہی تھی۔

رمیش چلنے لگا۔

اچانک اس کے قدم رک گئے۔

اور اس نے پلٹ کر بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔

آگے آگے شی شی اور پیچھے پیچھے وہ دونوں آ رہے تھے۔

رمیش اب بھی نرسری رائم گنگنا رہا تھا۔

SNOW SNOW FASTER

WHITE ALABASTER..

اس کی بیوی سردی سے کانپ رہی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں خاصی روشنی ہو چکی تھی۔ رمیش پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ غالباً اس نے گرم پانی سے غسل بھی کیا ہو گا۔ وہ یوں ہی لیٹی رہی۔ اس کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ اور سر قدرے بھاری تھا۔ رات گو وہ مزے سے سوئی تھی۔ لیکن اس وقت؟ . . . . . . آس نے کروٹ

بدلی۔ بدن کو سکیڑ کر لحاف سے لپیٹا۔ بالکل یخ تھا وہ لحاف۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ برف نہیں گر رہی تھی، لیکن برف سے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں نکل گئے ہیں صبح سویرے ہی۔ ششی بھی ابھی تک اُس کے کمرے میں نہ آئی۔ وہ تو روز ہی آ کر اُسے جگا جاتی۔ اُسے گدگداتی، اُس کی چٹکیاں لیتی۔ اُس کے کان میں کوئی جملہ کہہ کر خود قہقہے لگاتی۔ لیکن آج ۔ ۔ ۔ — ؟

شاید وہ دونوں نکل گئے ہیں۔ لیکن نہیں، رمیش کا نائٹ گون، ذرا دور کھونٹی پر تو سامنے ٹنگے ہیں۔

اچانک وہ بستر سے اُچھل پڑی۔ اور فرش پر آ کھڑی ہوئی۔ لیکن فرش پر اُس کے پاؤں نہیں ٹھہر رہے تھے۔ وہ کانپ سی گئی۔ لیکن اُس نے سلیپروں میں اپنے پاؤں ڈالے اور فوراً نائٹ سوٹ میں دروازے سے نکل کر ششی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

وہ بستر سے اُٹھ چکی تھی۔ اور نائٹ گون میں کھڑکی کے سامنے ایستادہ تھی۔ اُس کے کھلے آوارہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ اور اُس کے ساتھ ہی رمیش کھڑا تھا۔ سوئیٹر میں، اُس کے بالکل قریب۔ اور اُس کا لمبا بازو ششی کے دائیں کندھے پر تھا۔ اُس کے بالوں میں اُلجھا، اُلجھایا ہوا۔

دونوں ہی نئی دنیا میں کھوئے تھے۔

اور مسز رمیش کو اچانک محسوس ہوا جیسے اُس کی رگوں کا خون برف کی مانند جم گیا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب واپس کمرے میں آئی۔

اندر کب اور کیونکر اپنے بستر پر آ گری۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب رمیش دوڑتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ اور ششی بھیگے ہوئے نائٹ گون اور اُلجھے ہوئے بالوں کے ساتھ ہاتھوں میں برف لے کر اس کے پیچھے پیچھے بچوں کی طرح شور مچاتی ہوئی داخل ہوئی۔

"ارے تم ابھی تک سو رہی ہو؟"

رمیش نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

"طبیعت اچھی ہے نا؟"

ششی برف کھڑکی سے باہر پھینک کر اس کے قریب آئی۔

"ہاں ٹھیک ہوں"

اس نے بیٹھ کر کہا۔ "کل ذرا زیادہ سردی لگ گئی تھی اور بس"

"بھئی آج تو خوب کپڑے پہن لینا"

رمیش اس کے اُلجھے اُلجھے خشک بالوں سے کھیلنے لگا۔ "کھلن مرگ میں خوب سردی پڑتی ہے۔ دونوں سویٹر پہن لینا۔ ٹھیک ہے"

"ہو سکے تو میرا بھی۔ خوب گٹھڑی بن جاؤ گی"

ششی ہنس رہا تھا۔

"ہاں بالکل!"

"اچھا دیکھئے، آج ہی اسکیٹنگ بھی ہو گی نا؟" ششی نے مچل کر کہا۔

"جی ہاں۔ لیکن وہاں ہڈی پسلی توڑ کے نہ آنا"

"میں تو آپ کے سر پر سوار رہوں گی۔ ہاں کیوں؟" اس نے مسز رمیش کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں اور کیا، یہ تو خوب اسکیٹنگ کر چکے ہیں۔" مسز رشمی کو اپنی آواز
دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اجنبی سی آواز، اور اس آواز کی کپکپاہٹ
کسی نے بھی محسوس نہ کی۔

"اچھا تو لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" رشمی نے نعرہ لگایا۔ "اب فوراً تیار
ہو جاؤ۔ میں لنچ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلا۔ رشمی بھی اپنے کمرے کی طرف چل دی اور وہ
ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ آج کا پروگرام ملتوی کیا جائے۔ اس کی طبیعت ٹھیک
نہیں تھی اور . . . . .

شام کے خنک سائے برف کی منجمد سپید لہروں پر اتر رہے تھے۔
کتنی سرد اور ویران شام تھی۔
وہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔

وہ دہکتے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ اس کے
لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ کتنی بے چینی، جلن اور تلخی میں اس نے یہ دن
گزارا تھا۔ کمرے کی اداس اور ویران دیواریں بار بار اسے کاٹ کھانے کو
لپکتیں۔ اور ایک چیخ اس کے گلے میں اٹک جاتی۔

اور یہ بھیانک خیال!
یہ لہراتے ہوئے ناگ!!
یہ ناگ اسے ڈستے رہے ______ اس کی روح کو ڈستے
رہے۔ یہ اندھیرے!

وہ دونوں گھوڑوں پر ساتھ ساتھ پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھ رہے
ہیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے خاموش راستے، خاموش درخت،

گھوڑے والے نہ جانے کہاں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ وہاں تنہا ہیں۔ تنہا۔ گھوڑوں کے قدم رُک گئے۔ اب اُن کی نظریں مل جاتی ہیں۔ وہ اُسے باہوں کا سہارا دیتے ہیں۔ اور وہ دونوں نرم برف کی ریشمی تہوں میں ڈوب جاتے ہیں!

"اُف ——— !"

اُس پہ پاگلوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

دو بار ہوٹل کے بوائے کی بے وقت آمد نے اُس کے خودکشی کے خیال کو درہم برہم کر دیا۔

کاش اُس نے خودکشی کی ہوتی۔

کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتی۔

کاش اُس نے آج اُنہیں کھلن مرگ نہ جانے دیا ہوتا۔

لیکن اُس نے کب اجازت دی تھی۔ اُس نے تو صرف اتنا کہا تھا۔ مجھے تھوڑا سا "ایکسپوزرڈ" ہوا ہے۔ ریسٹ سے ٹھیک ہو جاؤں گی۔ لیکن تم آج جاؤ۔ پروگرام سپوئل ہو گا۔ کل پھر جائیں گے ساتھ!"

صرف اتنا کہنے پہ وہ دونوں تیار ہو گئے۔

ہنہ ——— !

کتنا بدل گئے ہیں وہ!

اُس کی رگ رگ میں زہر کی تلخی دوڑ گئی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ اور اُس کی طرف لپکے۔ مسرور، خنداں خنداں!!

دوسرے ہی دن وہ سری نگر واپس پہنچ گئے۔

آج صبح ہی سے دھوپ نکل آئی تھی۔ اور برف کی تہیں پگھل کر ڈھلوانوں پر سے ندی نالوں کی صورت بہہ رہی تھیں۔

اُنہوں نے کل رات ہی اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ مسز ریش نے بہت سنجیدگی سے واپس چلنے کو کہا تھا۔ اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اُس کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ اور ریش نے جب درمیان سی خاموشی کو توڑ کر کہا۔

"کوئی فکر نہیں۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گی"

تو اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں ہر حالت میں واپس جانا چاہتی ہوں"

"مگر کیوں؟" ششی سراپا سوال تھی۔ اور حیرت سے اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

آج صبح آنکھ کھلنے پر اُس کی طبیعت قدرے اچھی تھی لیکن وہ پھر بھی بضد رہی کہ "وہ جلد سے جلد واپس بمبئی جانا چاہتی ہے۔"

اور وہ تینوں واپس ٹنگرگ آ چکے تھے۔

تینوں خاموش تھے۔

جب مسز ریش گھوڑے سے اُتر کر ریستوران کی طرف جانے لگی۔ نظریں جھکائے، برفیلے پانی میں احتیاط سے قدم اُٹھاتے ہوئے، تو ایک جانی پہچانی زوردار آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"ہلو مسز ریش، آپ لوگ جلدی واپس آئے۔ کیوں! کیا بات ہے!"

یہ ڈاکٹر ٹیسرو تھے۔

"جی ـــــ جی پروگرام بدل دیا ہم نے۔"

وہ جلد اُن سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

لیکن وہ زور سے بولے۔

"خوب آمیخواٹ" کیا ہو گا آپ نے؟"

"جی ——— جی ہاں ———" اُس کے ہونٹوں پر یخ بستہ مسکراہٹ پھیلی اور اُس کی خالی سونی نظریں سامنے پہاڑوں سے ٹکرائیں۔

"تم جھوٹ کہتی ہو ——— جھوٹی ——— !!"

برف کے پہاڑ چیخ اٹھے۔

برف کے پہاڑ آگ اگلنے لگے۔

اور ڈاکٹر نیر دکندھے جھٹکتے ہوئے رمیش اور مس ششی بھاٹیہ کی طرف بڑھنے لگے

کتابت
ضمیر زاہد